منشورِ اسلام

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

منشورِ اسلام

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

مترجم
ڈاکٹر ابصار احمد
ایم فل، پی ایچ ڈی

شائع کردہ
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

نام کتاب ــــــــــــــــــــ منشور اسلام

اشاعت اول (دسمبر۱۹۹۴ء) ــــــــــــــــــــ ۱,۰۰۰

ناشر ــــــــــــ ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مطبع ــــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس 'لاہور

قیمت ــــــــــــــــــــ ۲۷ روپے

مقام اشاعت ــــــــ ۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور۔۵۴۷۰۰

فون : ۴۔۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس :

۱۱ داؤد منزل' نزد آرام باغ' شاہراہ لیاقت

فون : ۲۱۶۵۸۶

فہرست عنوانات

پیش لفظ

از مترجم

ڈاکٹر محمدؐ رفیع الدین مرحوم کے انتقال کو ربع صدی سے زیادہ ہونے کو آرہی ہے۔ ان جیسے مفکروں کی علمی وفکری خدمات کے کماحقہٗ اعتراف اور تحسین کے لیے یہ مدّت بہت مختصر ہے جن کا فکر ذہنِ رسا کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور سوچنے اور جذبۂ عمل رکھنے والوں کے لیے عرصۂ دراز تک مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے افکار کا مطالعہ ہمارے لیے بیک وقت سرچشمۂ علم بھی ہے اور نسخۂ عمل بھی۔ بنیادی طور پر ڈاکٹر صاحب مرحوم تجدیدِ فکرِ اسلامی کی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں جس کا آغاز علامہ اقبال نے کیا تھا اور اس حوالے سے موجودہ دور کی علمی گمراہیوں سے اہلِ اسلام کو باخبر کرکے ان پر اسلام کی حقانیت واضح کرتے ہیں۔ مغرب کے غلط فلسفیانہ نظریات (مثلاً سیکولرازم، فرائڈازم، ایڈلرازم، میکڈوگل ازم اور مارکسزم وغیرہ) جو علمی اور عملی دونوں اعتبارات سے پوری نوعِ انسانی پر مسلط ہو چکے ہیں، اسلام کو ایک زبردست علمی چیلنج دیتے ہیں، اور جب تک مسلمان اہلِ علم اس چیلنج کا مسکت جواب نہیں دیتے اسلام کی عالمگیر اشاعت کے لیے راستہ صاف نہیں ہوسکتا۔ اور مسلمان قیادتِ اقوام کے اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے جو اللہ نے کلام پاک کی متعدد آیات کی رو سے ان کو سونپا ہے۔

اس سلسلے میں ان کی بنیادی کتاب انگریزی میں بعنوان "Ideology of the Future" ہے جو آج سے تقریباً نصف صدی قبل لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا استدلال مغرب کے فلسفیانہ نظریات کی تردید ہی نہیں کرتا بلکہ "لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ" کے مصداق، جیسا کہ اس کے نام (یعنی مستقبل کا نظریۂ حیات) سے ظاہر ہے پڑھنے والوں کو اس نتیجہ پر بھی پہنچاتا ہے کہ فطرتِ انسانی کے اٹل اور لازوال قوانین کے عمل سے جو نظریۂ حیات بالآخر پوری دنیا میں پھیل کر رہے گا وہ اسلام کے سوائے کوئی اور نہیں۔

اس کتاب کا بیشتر حصّہ ادق فلسفیانہ زبان اور استدلال پر مبنی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں مصنف کھل کر تو نہیں لیکن بین السطور یہی علمی رائے رکھتے نظر آتے ہیں کہ جس آئیڈیل اور آدرش کا ایک سلیم الفطرت انسان ہمیشہ سے متلاشی رہا ہے اس کی کامل ترین تصویر اسلام کے زریں اصول پیش کرتے ہیں خوش قسمتی سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی محولہ بالا کتاب جس کا انداز بیان سراسر فلسفیانہ ہے، کا ایک آسان ایڈیشن بھی جو قرآن وحدیث کے حوالوں سے مزیّن ہے، تحریر فرمایا جو نسبتاً مختصر ہے اور آسان انگریزی زبان میں ہے جس کا ٹائیٹل "Manifesto of Islam" ہے یعنی اسلام کی تشریح ایک ایسے نظریۂ زندگی کی حیثیت سے جو آخر کار انسانیت کے تمام دکھوں کا مداوا کرے گا اور دنیاوی واخروی فوز و فلاح کا ضامن بنے گا۔ یہ کتاب کارل مارکس کی مشہور تصنیف "Communist Manifesto" کے پورے سو سال بعد تحریر کی گئی۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مصنف نے اس کا اردو ترجمہ ماہنامہ "میثاق" لاہور کے لیے خود شروع کیا تھا۔ لیکن ابتدائی پچاس پچپن صفحات کا ترجمہ کر پائے تھے کہ اچانک حادثاتی موت کے ذریعے مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ چنانچہ ان کے اپنے ترجمے کی پانچویں قسط دسمبر ۶۹ء کے "میثاق" میں ان کی وفات پر تعزیتی شذرے کے ساتھ ہی شائع ہوئی تھی۔ (یہ شذرہ بھی اپنی بے ساختگی اور جامعیت کی بنا پر اس کتاب کے ضمیمے کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔)

برادر مکرم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خواہش پر خاکسار نے اس کے باقی ماندہ حصے کا اردو میں ترجمہ مکمل کیا اور یہ پورا مواد بالاقساط مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ماہانہ جریدے "حکمت قرآن" میں چند برس قبل شائع کیا گیا۔ اور اب افادۂ عام کی خاطر پورے ترجمے کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ "کمیونسٹ مینی فسٹو" کی بنیاد پر برپا کیا ہوا اشتراکی انقلاب اور سوویت یونین تو اس دوران قصّہ پارینہ بن چکے ہیں، البتہ "مینی فسٹو آف اسلام" میں دیا گیا تہذیبی و ریاستی خاکہ ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس عظیم کتاب کو تحریر کرنے کا اجر عطا فرمائیں اور ہمیں اس منشور کے مطابق عمل کر کے اسلام کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلانے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین

ڈاکٹر ابصار احمد عفی عنہ

۱۹ دسمبر ۱۹۹۴ء

منشورِ اسلام

یعنی اسلام کی تشریح ایک ایسے نظریۂ زندگی کی حیثیت سے جو آخر کار لازماً پوری دنیا میں پھیل کر رہے گا

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝

یہ (کفّار اور مشرکین) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نوُر کو اپنے مونہہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں۔ لیکن اللہ اپنے نور کو پُورا کیے بغیر نہیں رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی بُری کیوں نہ لگے

اللہ ہی تو وہ ذات ہے جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور دینِ حق (سچے نظریۂ حیات) کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس دینِ حق کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرکوں کو کتنی ہی ناخوشی کیوں نہ ہو۔

سورۂ توبہ آیات ۳۲، ۳۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

عالمی معاملات میں موجودہ بحران، جس کی وجہ سے تہذیب کی کامل بربادی کا ہی نہیں بلکہ نسلِ انسانی کی مکمل تباہی کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا ہے، نوعِ انسانی کو اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اس کا علاج دریافت کرے۔ حال ہی میں انہیں مذہب سے یکایک از سرِ نو دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اس سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں کہ کیا اگر مذہب کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو وہی انسانوں کے لیے ان خطرات اور مصائب سے محفوظ رہنے کے لیے واحد پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے جو آج ان کے سروں پر منڈلا رہے ہیں؟

دوسری طرف مسلمان ساری دنیا کے سامنے علی الاعلان اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ صرف اسلام ہی وہ نظریۂ حیات ہے جو نسلِ انسانی کو مستقل اور مکمل طور پر متحد کر سکتا ہے۔ دنیا میں پائدار امن و امان قائم کر سکتا ہے اور انسان کو اس کے ذہنی، اخلاقی، مادّی اور روحانی ارتقار کی اس انتہائی منزل تک پہنچا سکتا ہے جسے پا لینے کی صلاحیّت اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔

لہٰذا قدرتی طور پر مسلمانوں کے اُوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو بتائیں کہ اسلام کیا ہے؟ اسلام اور دوسرے مذاہب میں فرق کیا ہے؟ اسلام کے دعاوی کی عقلی اور علمی بنیادیں کیا ہیں؟ اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اور وہ ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے کیا ذرائع اختیار کرتا ہے؟

"منشورِ اسلام" انہی سوالوں کے مختصر جوابات پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔

لفظ "مینی فیسٹو" (منشور) عموماً کسی بادشاہ یا مملکت یا منظّم انسانی جماعت کی طرف سے کسی ایسے اعلان کے معنی میں مستعمل ہوتا رہا ہے جس کی رُو سے عوام کو یہ بتانا مقصود ہو کہ ماضی میں کیا کیا کارنامے انجام دیئے گئے ہیں اور آئندہ جن کارناموں کے انجام دینے کا اعلان کیا جا رہا ہے، ان کی تفصیلات اور وجوہات کیا ہیں؟ لیکن گذشتہ سو سال سے یعنی جب سے "کمیونسٹ مینی فیسٹو" اشتراکیت کی عالمگیر

تبلیغ کے آلۂ کار کی حیثیت سے شائع ہوا ہے (جس کے نتیجہ کے طور پر یہ نظریۂ حیات اب فی الواقع دنیا میں ایک عظیم سیاسی طاقت کی شکل میں رونما ہوگیا ہے) اس لفظ کو یہ نیا مفہوم حاصل ہوگیا ہے کہ وہ ایک ایسے تحریری اعلان پر وکالت کرنے لگا ہے جو عالمگیر قبولیت کی تمنّا رکھنے والے ایک نظریۂ حیات کی تاریخی بنیادوں، اساسی اصُولوں اور متوقع کامیابیوں کی تشریح کرتا ہو۔ مَیں نے اس لفظ کو اسی مؤخرالذکر معنی میں استعمال کیا ہے۔

اس کتاب کے پڑھنے والوں پر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ اسلام کے بنیادی اصُولوں کی تشریح کی حیثیت سے اس کا موضوع تاریخ کے ایک ایسے نظریہ کی صورت اختیار کرتا ہے جو فطرتِ انسانی کے ایک تصوّر پر مبنی ہے۔ جس کی رُو سے اسلام مستقبل کا وہ آخری اور عالمگیر نظریۂ حیات قرار پاتا ہے جو ناگزیر طور پر دنیا کے کناروں تک پھیل کر رہے گا۔ فطرتِ انسانی کے اس تصوّر کی مرکزی حقیقت یہ ہے کہ کسی نصب العین کی محبت کا جذبہ انسان کے تمام اعمال کی (حتیّٰ کہ اُن اعمال کی بھی جو بظاہر اس کی حیوانی جبلّتوں کے منبع سے سرزد ہوتے ہیں) واحد حقیقی اور بنیادی قوّتِ محرکہ ہے اور یہ جذبہ ایک ایسے نصب العین کی محبّت سے ہی مکمل اور مستقل طور پر مطمئن ہوسکتا ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو۔

یہ حقیقت مارکس کے بنیادی فلسفہ سے ہی متصادم نہیں ہوتی بلکہ فرائڈ، ایڈلر، اور میک ڈوگل کے ان نفسیاتی نظریات، سے بھی متصادم ہوتی ہے جن کو عصرِ حاضر میں بالعموم فطرتِ انسانی کے معیاری اور صحیح نظریات سمجھا جاتا ہے۔ اگر منشورِ اسلام کے پڑھنے والے اُن حقائق کو زیادہ تفصیل کے ساتھ جاننا چاہتے ہوں جو ان تمام نظریات کے بالمقابل اس حقیقت کی سچّائی کو (اور اس سے اخذ کیے ہوئے دوسرے فلسفیانہ تصوّرات کی سچائی کو بھی جو اس منشور میں زیرِ بحث آئے ہیں) تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو اُن کو چاہیے کہ میری انگریزی کتاب "مستقبل کا نظریۂ حیات" (IDEOLOGY OF THE FUTURE) ملاحظہ فرمائیں (شائع کردہ شیخ محمد اشرف تاجرِ کتب کشمیری بازار لاہور)

محمد رفیع الدّین

اسلام کیا ہے؟

اسلام کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اسلام اس نظریہ حیات کا نام ہے جس کی تعلیم انبیاء کرام علیہم السّلام ابتدائی زمانہ سے دیتے رہے ہیں۔ دنیا کے تمام خطّوں میں بے شمار انبیاء وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں تاکہ نوعِ انسانی کے تمام حصّوں کو اُن کے زمانہ کے حالات ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی ارتقا کے مقامات کے مطابق اس نظریۂ حیات کی تعلیم دیں۔

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ط (۳۵-۲۴)

اور کوئی اُمّت (قوم) ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط (۴۰-۷۸)

اور ہم نے تم سے پہلے (بہت سے) پیغمبر بھیجے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کے حالات تم سے بیان کر دیئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات بیان نہیں کیے

ان انبیاؑ کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے زیادہ کیا گیا ہے، اور چونکہ ان سب کی دعوت بنیادی طور پر یکساں رہی ہے اس لیے ہر نبی نے اپنے پیش رو انبیاء کی صداقت کی گواہی دی ہے اور اپنے بعد آنے والے نبی کے ظہور کی پیش گوئی کی ہے۔ بہرحال چونکہ حضرت محمدؐ کی نظری تعلیم اور عملی زندگی کی مثال میں تمام انبیاء کی دعوت کی نظری تلقین اور انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر (جن میں ان کی زندگی کے عمرانی، اقتصادی، سیاسی اور فوجی شعبے بھی شامل ہیں) اس کا عملی اطلاق دونوں اپنے کمال کو پہنچ گئے ہیں لہٰذا آپ بجا طور پر آخر الانبیاء قرار پائے ہیں اور "اسلام" کی اصطلاح بھی آپ ہی کی تعلیمات کے لیے جو قرآن اور سنّت کے اندر موجود ہیں مخصوص ہوگئی ہے۔ چونکہ تمام انبیاء کی تعلیم بنیادی طور پر ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی جو خدا کی ذات ہے ایک ہی ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ جو شخص گذشتہ انبیا میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے وہ سچّا مسلمان نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

(متقی یعنی سچے مسلمان) وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپؐ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا (۲-۴)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۲-۱۳۶)

(مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لاتے اور جو کتاب ہم پر اُتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر اور جو کچھ اور پیغمبروں پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اس پر (ہم ان سب پر ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (اللہ) کے فرمانبردار ہیں۔

اسلام کی روح

اگر تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ لفظ "محبّت" ہے اسلام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ محبّت کریں اور اپنی محبّت کو جس قدر زیادہ پاکیزہ یکسو خالص، بے لوث اور صمیم قلب سے صادر ہونے والی بنا سکتے ہیں بنائیں اور پھر ان کی محبّت ایسی ہو کہ وہ ہمیشہ عظیم سے عظیم تر، کمال پاکیزگی اور خلوص کی جانب بڑھتی رہے اور اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کسی کمی، کمزوری یا مایوسی کے آثار پیدا نہ ہوں۔

اسلام کی ضرورت

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبوّت کا ظہور درحقیقت کارخانۂ قدرت میں کسی مقصد کو پورا کرتا ہے؟ کیا انسان کو واقعی اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے کامل دائمی اور مخلصانہ محبّت کی تربیت اور ترقی

کا وہ طریقہ سکھایا جائے جس کی تعلیم انبیاء دیتے چلے آئے ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک کامل، پائدار اور مخلصانہ محبّت ——— جو ایک نصب العین کے حصول کی والہانہ شکل اختیار کرتی ہے۔ انسان کی تمام فطری خواہشات میں سب سے زیادہ طاقتور ہے اور سب خواہشات پر غالب آنے والی خواہش ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ خواہش چونکہ انسان کی تمام دوسری خواہشات کو اپنے تابع رکھتی ہے یوں کہنا چاہیے کہ وہ دراصل اس کی فطرت کی ایک ہی خواہش ہے اور انسان اسی خواہش سے عبارت ہے اور نبوّت کی اہمیت یہ ہے کہ صرف وہی انسان کی اس خواہش کی صحیح، مکمل اور مستقل تشفی کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا نبوّت کا عالمِ فطرت میں ایک خاص مقصد ہی نہیں، بلکہ وہ کارخانۂ قدرت کے نظم ونسق کو چلانے کے لیے ناگزیر ہے۔

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ (۳۰-۳۰)

پس (اے پیغمبر) آپ دین (یعنی توحید اور اس کے متضمنات) پر یکسوئی سے قائم رہیے یہ (دین) انسان کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت میں کوئی ردّ و بدل ممکن نہیں (لہٰذا) یہی دین پائدار ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے۔

انسانی فطرت کا تجزیہ، انسان کی طبعی خواہشات کے دو درجے، انسان کی نچلے درجہ کی خواہشات

فطرتِ انسانی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی طبعی خواہشات کے دو درجے ہیں۔

اوّل: وہ خواہشات جو بحیثیت حیوان، انسان کی فطرت سے صادر ہوتی ہیں اور جنہیں انسان کی جبلّتی خواہشات کہا جاتا ہے۔ مثلاً خوراک کی خواہش، جنسی رابطہ کی خواہش۔ مخالف سے مقابلہ کرنے

اور راستہ سے ہٹانے کی خواہش۔ ان جبلّتی خواہشات کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(ا) یہ خواہشات انسان اور اُن حیوانات میں مشترک ہیں جو درجۂ ارتقاء میں اس سے فروتر ہیں۔ مثلاً گائے، گھوڑا، اونٹ وغیرہ۔

(ب) ان خواہشات میں ایک داخلی حیاتیاتی دباؤ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے حیوان ان کی تسکین کی جستجو پر مجبور ہوتا ہے۔

(ج) ان خواہشات کی تسکین سے ایک خاص قسم کی مسرّت یا آسودگی حاصل ہوتی ہے۔

(د) ان کی تسکین حیوان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی صحت اور اپنی جسمانی نشو و نما کو برقرار اور اپنی زندگی اور نسل کو محفوظ رکھے۔

انسان کی بلند تر درجہ کی خواہشات

دوئم: وہ خواہشات جو بحیثیّت انسان، اس کی فطرت سے سرزد ہوتی ہیں۔ انکی تفصیل یہ ہے:

(ا) نصب العین کی خواہش۔

(ب) اخلاقی عمل کی خواہش۔

(ج) حصول علم کی خواہش۔

(د) فنی تخلیق کی خواہش۔

ان خواہشات کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(ا) یہ خواہشات انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان میں دوسرے حیوانات اسکے ساتھ شریک نہیں۔

حیوان اور انسان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک حیوان صرف جانتا ہے، محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے لیکن ایک انسان صرف جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہی نہیں بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جان رہا ہے، محسوس کر رہا ہے اور سوچ رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک حیوان صرف ذی شعور ہوتا ہے مگر ایک انسان خود شعور بھی ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے حیوان اور انسان کی فطرتوں میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ وہ خواہشات جو انسان سے خاص ہیں اس کی

خودشعوری یا خودی کی خواہشات ہیں۔

(ب) ان خواہشات سے کوئی حیاتیاتی اضطرار وابستہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ وہ آزاد خواہشات ہیں جو فقط زندگی کی نفسیاتی سطح سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی تشفی کا راستہ جبلّتوں کی طرح حیاتیاتی اعتبار سے معین نہیں ہوتا۔

(ج) ان میں سے ہر خواہش کی تشفی سے ایک خاص قسم کی مسرّت حاصل ہوتی ہے جو اپنی بہترین اور بلند ترین حالت میں اپنی کیفیت اور شدّت کے لحاظ سے اس مسرّت سے بدرجہا افضل ہوتی ہے جو انسان کو جبلّتی خواہشات کی تشفی سے حاصل ہوتی ہے۔

(د) جب یہ اپنی بہترین اور بلند ترین صورت میں ہوں تو ان کی تشفی خود ان کی تشفی کی خاطر ہی عمل میں لائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور محرک یا مقصود نہیں ہوتا۔

(ہ) ان کا مقصد حسن کی جستجو ہوتا ہے۔ مثلاً نصب العین کی محبّت ہی کو لیجئے۔ نصب العین ایک ایسا تصوّر ہوتا ہے جس کی طرف انسان وہ سارا حسن منسوب کرتا ہے جو اس کے خیال میں آسکتا ہے۔ اسی طرح سے اخلاقی فعل یا نیکی حسن کے عملی اظہار کا ایک ذریعہ ہے اور علم کی خواہش درحقیقت صداقت یا سچّائی کی خواہش ہے اور صداقت ایک ایسی چیز ہے جسے ہم سراہتے اور پسند کرتے ہیں یعنی جس کی طرف ہم حسن کو منسوب کرتے ہیں اور فن یا آرٹ کسی واسطے کے ذریعہ سے حُسن کے اظہار ہی کا نام ہے۔

آرٹ کی ایک عام قسم

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فن یا آرٹ اینٹ، پتھر، آواز، صدا، رنگ، لفظ یا حرکت میں حسن کا اظہار ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لہٰذا وہ ایک ایسا مشغلہ سمجھ لیا گیا ہے جس میں صرف وہ چند افراد ہی حصّہ لے سکتے ہیں جنہوں نے اس غرض کے لیے خاص طور پر تربیّت حاصل کی ہو یا جن کو اس مشغلہ کے لیے قدرت کی طرف سے ایک خاص ملکہ عطا ہوا ہو۔ لیکن آرٹ کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں تمام انسان مساوی طور پر شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں اور وہ طرز بود و باش میں حسن کا اظہار ہے مثلاً جب ہم اپنے مکان کے بنانے اور سجانے میں، اپنے لباس میں، اپنی رفتار و گفتار میں، کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں، دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں، اپنے مادی ماحول کی تخلیق میں اور اپنے تمام

کاموں میں ظاہری طور پر حسن کا اظہار کرتے ہیں تو ہم ایک قسم کے آرٹ میں حصہ لے رہے ہوتے ہیں۔

نصب العین کی خواہش انسان کی تمام دوسری خواہشات پر حکمران ہوتی ہے

نصب العین کی خواہش انسان کی ان تمام خواہشات پر حکومت کرتی ہے جو اس کی زندگی کی نفسیاتی سطح سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کا ذکر معاً اوپر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ان خواہشات میں سے کوئی اپنی اصلی حالت میں اس بڑی خواہش کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو تو وہ اس کو بدل کر ان تقاضوں کے مطابق کر لیتی ہے۔ اُوپر عرض کیا گیا تھا کہ اپنی اصلی حالت میں ان خواہشات میں سے ہر خواہش صرف اپنی ہی تشفی چاہتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مقصد (مثلاً کسی دوسری خواہش کی خدمت یا اعانت) نہیں ہوتا۔ لیکن جب نصب العین پوری طرح سے حسین نہ ہو تو پھر ان میں سے کوئی خواہش بھی اپنی اصلی حالت میں اس کے مطابق نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں نصب العین کی خواہش ان میں سے ہر ایک کو بدل کر اپنے مطابق کر لیتی ہے اور یہ تبدیلی غیر شعوری طور پر عمل میں آتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو بالکل علم نہیں ہوتا کہ اس نے ان خواہشات کو اپنے اصلی راستہ سے ہٹا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نصب العین کے چاہنے والوں کا ضابطہ اخلاق اور علم اور آرٹ الگ ہوتا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ نصب العین کی خواہش انسان کی نفسیاتی یا جمالیاتی سطح کی خواہشات پر کیوں حکمران ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان وہ سارا حسن جس کی تمنّا اس کی فطرت کے ایک تقاضا کے طور پر اس کے دل میں ہوتی ہے اپنے نصب العین کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ دیکھے کہ اس کی کوئی خواہش اس حسن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تو جب تک وہ اس کو بدل کر اس حسن کے مطابق نہ کرے وہ اسے نہ جویائے حسن سمجھ سکتا ہے اور نہ درست۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ نصب العین کی خواہش انسان کی نفسیاتی اور جمالیاتی خواہشات پر ہی نہیں بلکہ اس کی جبلّتی خواہشات پر بھی حکمران ہے۔ ایک حیوان کے لیے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی جبلّتی خواہش کے دباؤ کو روک سکے۔ اس کے برعکس انسان اپنی کسی جبلّتی خواہش کی تشفی اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا نصب العین اجازت نہ دے اور وہ اپنی ہر جبلّتی خواہش کی تشفی صرف اسی

حد تک کرتا ہے جس حد تک اس کا نصب العین اجازت دیتا ہو۔ جب ایک انسان کا نصب العین یہ تقاضا کرتا ہو کہ وہ اپنی زندگی کو قائم رکھے، تو وہ اس کو قائم رکھنے کے لیے اپنی جبلّتی خواہشات کی مناسب تشفی کے لیے پوری کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب نصب العین کا تقاضا یہ ہو کہ انسان اپنی زندگی کو اس کی حفاظت کے لیے قربان کر کے شہید ہو جائے تو وہ جبلّتی خواہشات کی تشفی سے ہی نہیں بلکہ خود زندگی سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اُسے قربان کرنے کے لیے بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جو ان لاتعداد واقعات کی تشریح کرتی ہے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے نصب العین کی خاطر یہ جانتے ہوئے زندان میں جانا قبول کر لیا ہے کہ وہاں اُسے اپنی جبلّتی ضروریات کو روکنا یا ترک کرنا پڑے گا یا اُسے سخت قسم کی بدنی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے سوائے چارہ نہ ہو گا یا فلاں شخص نے نصب العین کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دیا ہے یا دار پر چڑھنا یا میدان جنگ میں گولی کھا کر مرجانا قبول کر لیا ہے۔

اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ انسان بالآخر اور درحقیقت صرف ایک ہی خواہش رکھتا ہے اور وہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ تمام نفسیاتی یا جبلّتی خواہشات اس ایک خواہش کے تابع اور اس کی خدمت گزار ہوتی ہیں۔ یہی ایک خواہش اس کے تمام اعمال و افعال کی اصلی اور بنیادی قوّت محرکہ ہوتی ہے اور اس کی فطرت کی کوئی اور قوّت اس کے کسی عمل یا فعل کو پیدا نہیں کرتی۔ یہی خواہش فطرت انسانی کا وہ طاقتور اور زبردست جذبۂ عمل ہے جس کو فرائڈ نے غلطی سے جنسی محبّت کا جذبہ سمجھا ہے۔ جیسے ایڈلر نے نادانی سے قوّت یا غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا جذبہ قرار دیا ہے۔ جس پر میکڈوگل کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ انسان کی جبلّتی یا حیوانی خواہشات کے ایک پُراسرار مرکب کا جذبہ ہے اور جسے کارل مارکس نے بلادلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ انسان کی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔

نصب العین کی خواہش اور نوعِ انسانی کی ذہنی اور اخلاقی صحت

اگر نصب العین کی خواہش کسی رکاوٹ یا مایوسی سے دوچار ہو جائے تو انسان کی شخصیت

دب جاتی ہے اور کمزور ہو جاتی ہے اور انسان پریشان اور غمگین ہو جاتا بلکہ بعض وقت شدید قسم کی ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر یہ خواہش مسلسل اور مکمل طور پر مطمئن ہو رہی ہو تو انسان کے لیے ترقی پذیر راحت اور مسرّت کا باعث ہوتی ہے۔ ایک انسان کو جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے محبّت ہوتی ہے۔ اسی قدر زیادہ اس کی شخصیت بھی متحد اور جوان اور صحت مند اور توانا اور بلند اور بالا ہوتی ہے اور اسی قدر زیادہ اس کی زندگی کی مسرّت اور راحت اور طمانیت بھی مکمل اور بھرپور ہوتی ہے۔

تاریخ کا مُدعا

لہٰذا جب سے انسان کو اپنے آپ کا شعور حاصل ہوا ہے انسان ایک ایسے نصبُ العین کی جستجو میں مصرُوف ہے جس کے سامنے وہ مستقل طور پر اور اپنے دل کی پُوری رغبت کے ساتھ اپنی والہانہ محبّت اور خدمت اور اعانت اور ستائش اور پرستش کے نذرانے پیش کر سکے یعنی ایک ایسا نصب العین جو حُسن اور کمال کے بلند ترین اور دائمی اور ابدی اوصاف سے آراستہ ہو تاکہ اس کی محبّت انحطاط اور زوال اور مایوسی کے حادثات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔

بسا اوقات اس قسم کے نصب العین کی جستجو اُسے شدید مصائب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بھیانک حادثات کے روبرو کھڑا کر دیتی ہے اور اس سے بڑی بڑی قربانیوں کی یہاں تک کہ جان کی قربانی کی قیمت وصُول کرتی ہے تاہم وہ اس جستجو کو ترک نہیں کرتا کیونکہ اس کی فطرت کا ایک زبردست اور بے پناہ تقاضا اسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ اسے ہر حالت میں جاری رکھے خواہ اس کے نتائج کچھ ہوں۔ نوع انسانی کی پُوری تاریخ (اپنے سارے مرحلوں اور شعبوں سمیت خواہ وہ سیاسی ہیں یا اخلاقی یا قانونی یا علمی یا فنی یا اقتصادی یا فوجی) جس میں جا بجا خوفناک ملک گیر اور عالمگیر جنگوں اور ان گنت انسانوں کی اندوہناک صعوبتوں کے نظارے بھی دکھائی دیتے ہیں فقط ان واقعات کی ایک داستان ہے جو حضرت انسان کو اپنے محبوب نصب العین کی حد درجہ دشوار جستجو کے دَوران شروع سے لے کر آج تک پیش آتے ہیں۔

نصب العین کی عمومی صفات

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان جس نصب العین کی جستجو کر رہا ہے وہ اس کے اندر فی الواقع کون

سے اوصاف کی موجودگی کی توقع کرتا ہے اس سوال کا جواب نصب العین کے لیے انسان کی فطری خواہش کی نوعیت کے اندر پہلے ہی سے موجود ہے کیونکہ یہ خواہش حسن کے لیے ہے وہ صرف ایک ایسے نصب العین سے ہی مطمئن ہو سکتی ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو یعنی

(۱) جو ہر اُس نقص یا عیب سے پاک ہو جس کا ہم انسان ہونے کی حیثیت سے تصوّر کر سکتے ہیں اور

(۲) جس میں وہ تمام اوصاف بدرجہ کمال موجود ہوں جن کو ہم اپنی فطرت کے تقاضوں کی بنا پر عمدہ اور حسین اور قابلِ ستائش اور لائق محبّت سمجھتے ہیں۔

نقص یا عیب محبّت کا دشمن ہے لہٰذا جونہی انسان کو اپنے نصب العین کے اندر کسی چھوٹے سے چھوٹے نقص کی موجودگی کا یا کسی چھوٹی سے چھوٹی خوبی کی عدم موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے اس کی محبّت کافور ہو جاتی ہے بلکہ نفرت میں بدل جاتی ہے۔ بے شک ایک انسان ایک زشت ناقص یا گھٹیا نصب العین سے بھی محبت کر سکتا ہے اور کرتا ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ وہ اس کی طرف غلطی سے حسن اور کمال کے وہ تمام اوصاف منسوب کر سکے جن کا وہ تصوّر کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دے سکے کہ یہ اوصاف درحقیقت اُس کے اندر موجود ہیں۔

ایک نصب العین کے خصوصی اوصاف

انسان کے نصب العین کے ان عمومی اوصاف سے ہم بڑی آسانی سے اُس کے نصب العین کے خصوصی اور تفصیلی اوصاف کا استنباط کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم ان عمومی اوصاف کی روشنی میں یہ جان سکتے ہیں کہ:۔

(۱) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کا حُسن غیر محدود اور لازوال ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ اس کے نصب العین کے حُسن کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ اس حد سے آگے اُس کا نقص شروع ہو جاتا ہے اور لہٰذا اس کا ایک حصّہ ناقص ہے پھر اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا حُسن عارضی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو جائے گا تو وہ مجبور ہوگا کہ اُسے آج بھی حسن سے محروم سمجھے۔

(۲) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین کوئی ایسی چیز ہو جو زندگی کا وصف رکھتی ہو کیونکہ وہ

کسی ایسی چیز کو اپنا محبوب نہیں بنا سکتا جو بے جان اور مُردہ ہو۔ انسان خود زندہ ہے لہٰذا وہ کسی مردہ چیز سے جو مردہ ہونے کی وجہ سے اس سے گھٹیا اور کمتر درجہ کی ہو محبّت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی ستائش کر سکتا ہے اور نہ خدمت کر سکتا ہے اور نہ اعانت۔ انسان کسی مردہ چیز کی ستائش اس وقت کرتا ہے جب وہ اس کی طرف نادانی سے زندگی کا وصف منسوب کر رہا ہو یا شعوری یا غیر شعوری طور پر اُسے کسی زندہ وجود کا مظہر سمجھ رہا ہو۔ ورنہ مردہ چیز کی خدمت اور اعانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو مردہ چیز کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی خدمت یا اعانت کر رہا ہے اور دوسرے خدمت یا اعانت کرنے والا اس کی خدمت یا اعانت کا نہ کوئی مفہوم معین کر سکتا ہے اور نہ مقصد۔

(۳) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کی زندگی اُس کے حسُن کی طرح دائمی ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ وہ مستقبل میں کسی وقت مر کر نیست و نابود ہو جائے گا تو وہ یہ محسوس کرنے کے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ وہ اب بھی ناپائدار ہے اور اب بھی بالقوہ مردہ ہی ہے اور وہ چھوڑ جانے والا دوست ہے جو قابل اعتماد نہیں۔

(۴) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کے اندر زندگی کی وہ تمام خصوصیات بدرجہ کمال موجود ہوں جن کا احساس وہ ایک زندہ وجود کی حیثیّت سے اپنی ذات میں کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ وہ سن سکے اور دیکھ سکے، سمجھ سکے، محسوس کر سکے، محبّت کر سکے اور محبّت کا جواب محبّت سے دے سکے۔ انسان کی دنیا کے اندر اس کا کوئی مقصود یا مدعا ہو جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہو اور اس بات کی طاقت رکھتا ہو کہ اس مقصود یا مدعا کو حاصل کرنے کے لیے عمل کر سکے اور اس عمل میں کامیاب ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ضروری ہے کہ وہ بعض آرا اور افعال کو پسند کرتا ہو اور بعض کو ناپسند اور اس بات کی قوّت رکھتا ہو کہ وہ جن آرا اور افعال کو پسند کرتا ہے ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کر سکے اور جن کو ناپسند کرتا ہے ان کی مخالفت کر سکے اور ان کو تباہ کر سکے۔ اپنے چاہنے والوں اور مددگاروں کو انعام عطا کر سکے اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سزا دے سکے۔ مختصر طور پر یہ کہ اُس کے اندر محبّت اور عدم محبّت کے تمام اوصاف موجود ہوں اور وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اُن کا اظہار کر سکے۔ اگر انسان کے نصب العین کے اندر ان اوصاف میں سے کوئی ایک وصف بھی موجود نہ ہو اور انسان کو اس کا علم ہو جائے تو اس کے لیے اپنے نصب العین سے محبّت کرنا یا اس کی خدمت اور اعانت

کے لیے کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

محبّت ہمیشہ محبوب کی خدمت کے لیے عمل کا تقاضا کرتی ہے اور یہی عمل اس کی علامت اور اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس عمل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبوب کو خوش کیا جائے اور اس کی محبت یا رضامندی یا پسندیدگی یا قرب کے احساس کی مسرّت حاصل کی جائے۔ ایک نصب العین کو چاہنے کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتے کہ نصب العین کے حصُول کے لیے کام کیا جائے یا جد وجہد کی جائے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچا جائے لیکن اگر انسان کا نصب العین اس قسم کا ہو کہ وہ نہ کسی عمل کو پسند کرتا ہو اور نہ ناپسند، نہ اس کے نزدیک کوئی چیز زشت ہو نہ زیبا نہ حق ہو نہ باطل اور نہ نیک ہو نہ بد۔ دوسرے لفظوں میں انسانی دُنیا کے اندر اس کا کوئی مدعا نہ ہو اور کوئی ایسا مقصد نہ ہو جس میں اس کے چاہنے والے اس سے تعاون کر سکیں تو ایسی حالت میں اس کے چاہنے والے کیونکر جان سکتے ہیں کہ اس کی محبّت کا اظہار کرنے کے لیے اور اس کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے اور اُسے خوش کرنے کے لیے اور اس سے قریب ہونے کے لیے ان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ انسان اپنے نصب العین کی محبّت کا اظہار کرنے کے لیے کوئی کام کرنا چاہتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کام کیا ہے۔ وہ ایسی محبّت سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ جو عمل کی صوُرت اختیار نہ کر سکے اور دل ہی دل میں رہے اور انسان کے عمل کو اوروں کے لیے چھوڑ دے۔ اگر انسان کو معلوم ہو کہ اس کا نصب العین نہ سن سکتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے، نہ محسوس کر سکتا ہے، نہ جان سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے، نہ محبّت اور عمل اور خدمت اور قربانی کی قدر دانی کر سکتا ہے اور نہ محبّت کا جواب محبّت سے دے سکتا ہے تو اس کے چاہنے والوں کے لیے اُن کے خادمانہ افعال اور اعمال کے اندر کوئی کشش باقی نہ رہے گی اور ان کو جاری رکھنے کے لیے کوئی داعیہ موجود نہ رہے گا۔ غور سے دیکھا تو جس چیز کو ایک انسان نیکی سمجھتا ہے وہ انگریزی زبان کی مشہور ضرب المثل کے خلاف کبھی اپنا انعام آپ نہیں ہوتی بلکہ اس کا انعام یہ مسرّت آمیز یقین ہوتا ہے کہ یہ اس کے نصب العین کو جسے وہ ہمیشہ ایک شخص یا شخصیّت تصوّر کرتا ہے پسند آتی ہے۔

(۵) ضروری ہے کہ ایک انسان کا نصب العین صاحب قدرت و قوت ہو کیونکہ اگر اسے معلوم ہو کہ اس کا نصب العین اپنے دوستوں اور مددگاروں کو صلہ دینے یا ان پر نوازش کرنے کی قدرت

نہیں رکھتا یا اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سزا دینے سے معذور یا بے بس ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس سے محبّت کرنا یا اس کی خدمت اور اعانت کرنا ایک بے فائدہ مشغلہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا کو اپنے نصب العین کے مطابق لانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہوگا اور بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا رہا ہوگا تو عین اس وقت اس کے مخالفین نہایت آسانی کے ساتھ اور کسی سزا کے خوف سے بے پروا ہو کر اس کے سارے کام کو بگاڑ رہے ہوں گے اور اس کی ساری کوششوں کو خاک میں ملا رہے ہوں گے اس صورت میں وہ یہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین کمزور اور ناتوان ہے اور اس کی محبّت اور پرستش کا حقدار نہیں۔

(۶) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کے اندر نیکی کے اوصاف بھی بدرجہ کمال موجود ہوں کیونکہ یہ اوصاف بھی حسن کے اوصاف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو سراہتے اور پسند کرتے ہیں۔ اگر اُسے معلوم ہو کہ اُن اوصاف میں سے کوئی وصف ایسا ہے جو اُس کے نصب العین میں موجود نہیں تو ضروری بات ہے کہ وہ اس کو ایک نقص قرار دے اور جس حد تک کہ اس کا نصب العین اس وصف سے عاری ہو اُسے حسن سے بھی عاری سمجھے اور اس سے محبّت نہ کر سکے۔

(۷) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین اپنے اوصاف میں بے نظیر اور بے مثال ہو اور کوئی ہمسر یا شریک نہ رکھتا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ سمجھے کہ کوئی اور تصوّر بھی اس کے اوصاف میں شریک ہے تو پھر وہ مجبور ہوگا کہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبّت کرے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کی فطرت کی رُو سے ناممکن ہے۔ کسی انسان کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے اور لہٰذا کوئی انسان بیک وقت دو نصب العینوں سے محبّت نہیں کر سکتا اور پھر حسن کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ بھی بیک وقت دو نصب العینوں میں اپنی حالت کمال پر موجود نہیں ہو سکتا۔

(۸) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین ایسا ہو کہ پُوری کائنات کی تخلیق اس کے مدعا کے مطابق ہو۔ دوسرے لفظوں میں ضروری ہے کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر کائنات کے جو قوانین مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں چونکہ اس کے اپنے پیدا کیے ہوئے نہ ہوں گے۔ لہٰذا وہ اس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدعا کے ساتھ متصادم ہوں گے یا پُوری طرح سے ہم آہنگ نہ ہوں گے لہٰذا وہ اور اس کا نصب العین

دونوں اس قابل نہ ہو سکیں گے کہ اپنے اس مدعا کو حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ سمجھے گا کہ کائنات جس میں وہ بھی شامل ہے خود بخود وجود میں آگئی ہے اور خود بخود قائم ہے اور اس پر اور اس کی اپنی ذات پر اس کے نصب العین کا کوئی اختیار یا تصرف نہیں تو وہ سمجھے گا کہ اس کے نصب العین کی حیثیت اگر اس کی اپنی ذات سے کم نہیں تو اس سے زیادہ بھی نہیں اور لہٰذا وہ اس بات کی ضرورت محسوس نہ کرے گا کہ وہ اس سے محبت کرے اس کی ستائش کرے یا اس کی خدمت کیلئے جانفشانیاں کرے

انسان کے نصب العین کی محولہ بالا دو عمومی اور بنیادی صفات کے اندر اور بہت سی صفات مضمر ہیں جن کا ہم اسی طرح ان صفات سے استخراج کر سکتے ہیں۔ چونکہ انسان کی فطرت کی رو سے یہی وہ صفات ہیں جو انسان اپنے نصب العین کے اندر موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا خواہ اس کا نصب العین کچھ ہو۔ ایک پتھر ہو یا ایک درخت ہو یا دریا ہو یا پہاڑ یا ایک بت ہو یا قوم یا نسل یا وطن یا ایک نظریہ یا ازم، وہ ان صفات کو اپنے نصب العین کی طرف ہر حالت میں منسوب کرتا ہے۔ بعض کو شعوری اور دانستہ طور پر اور بعض کو غیر شعوری اور نادانستہ طور پر۔ مثلاً خواہ انسان کا نصب العین کوئی مادی چیز ہو یا کوئی تصور، اس کا چاہنے والا اس کے ساتھ اس طرح سے برتاؤ کرتا ہے کہ گویا وہ ایک شخصیت ہے جس میں زندگی، قوت، حسن، نیکی اور صداقت کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو اس کے لیے ممکن بناتی ہے کہ وہ اس سے محبت کرے اور اس کی ستائش اور پرستش کرے اور اس کی خدمت کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائے۔

نصب العین کی محبت کا جذبہ اور حقیقتِ کائنات

اب غور فرمایئے کہ ایک طرف سے تو انسان کے اندر ایک ایسے نصب العین کی محبت کا زبردست جذبہ موجود ہے جو خالق کائنات ہو اور بدرجہ کمال حسن، نیکی، صداقت اور قوت کی صفات کا مالک ہو اور دوسری طرف سے کائنات کی کوئی تشریح اس سے زیادہ قابل یقین اور حقائق معلومہ اور مسلمہ کے مطابق نہیں کہ کائنات کی حقیقت ایک ایسا وجود ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو بدرجہ کمال حسن، نیکی، صداقت اور قوت کی صفات کا مالک ہے اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ نصب العین جسے نوع انسانی تاریخ کی کٹھن منزلوں میں تلاش کر رہی ہے (یعنی انسان کا صحیح

نصب العین) خود حقیقت کائنات کے سوائے اور کوئی نہیں۔ یہ ہے وہ ناقابل انکار اور عظیم الشان صداقت جسے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں اور جس پر وہ زور دیتے ہیں۔ ہر نبی جو دنیا میں آیا اس کی دعوت کی ابتداء اور انتہا یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: لا اِلٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوائے کوئی نہیں جو (اپنی صفات کی بنا پر) تمہاری محبت، ستائش، پرستش اور خدمت کا حق دار ہو۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی پیدا کیا تھا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

اسلام اور حقیقتِ کائنات کی صفات

قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم خدا کے لیے اللہ کا نام استعمال کریں یا رحمٰن کا یا کوئی اور نام۔ جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ تمام حسین نام صرف اُس کے ہیں اور کسی دوسرے کے نہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى

"اُسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔ خواہ تم اُسے کسی نام سے پکارو (لیکن یاد رکھو کہ) تمام اچھے نام اُسی کے ہیں"۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَآئِهٖ

"اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں پس ان ناموں سے اُسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارہ میں الحاد سے کام لیتے ہیں"۔

جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے سو اہم نام گنائے ہیں جو نیچے درج کیے جاتے ہیں:۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ ــــ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ (بہت مہربان) اَلرَّحِيْمُ (نہایت رحم والا)

اَلْمَلِكُ (بادشاہ)
اَلْقُدُّوْسُ (پاک ذات)
اَلسَّلَامُ (سلامتی والا)
اَلْمُؤْمِنُ (امن دینے والا)
اَلْمُهَيْمِنُ (نگرانی کرنے والا)
اَلْعَزِيْزُ (غالب)
اَلْجَبَّارُ (زبردست)
اَلْمُتَكَبِّرُ (بڑائی والا)
اَلْخَالِقُ (بنانے والا)
اَلْبَارِئُ (پیدا کرنے والا)
اَلْمُصَوِّرُ (صورت بنانے والا)
اَلْغَفَّارُ (بخشنے والا)
اَلْقَهَّارُ (دباؤ والا)
اَلْوَهَّابُ (بہت دینے والا)
اَلرَّزَّاقُ (روزی دینے والا)
اَلْفَتَّاحُ (کھولنے والا)
اَلْعَلِيْمُ (جاننے والا)
اَلْقَابِضُ (تنگ کرنے والا)
اَلْبَاسِطُ (کشادہ کرنے والا)
اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا)
اَلرَّافِعُ (بلند کرنے والا)
اَلْمُعِزُّ (عزت دینے والا)
اَلْمُذِلُّ (ذلیل کرنے والا)
اَلسَّمِيْعُ (سننے والا)
اَلْبَصِيْرُ (دیکھنے والا)
اَلْحَكَمُ (فیصلہ کرنے والا)
اَلْعَدْلُ (انصاف کرنے والا)
اَللَّطِيْفُ (مہربان)
اَلْخَبِيْرُ (خبردار)
اَلْحَلِيْمُ (بردبار)
اَلْغَفُوْرُ (بخشنے والا)
اَلشَّكُوْرُ (قدردان)
اَلْعَظِيْمُ (عظمت والا)
اَلْعَلِيُّ (بلندی والا)
اَلْكَبِيْرُ (بڑائی والا)
اَلْحَفِيْظُ (حفاظت کرنے والا)
اَلْمُقِيْتُ (روزی پہنچانے والا)
اَلْحَسِيْبُ (کفایت کرنے والا)
اَلْجَلِيْلُ (بزرگی والا)
اَلْكَرِيْمُ (عزت والا)
اَلرَّقِيْبُ (نگہبان)
اَلْمُجِيْبُ (قبول کرنے والا)
اَلْوَاسِعُ (کشائش والا)
اَلْحَكِيْمُ (حکمت والا)
اَلْوَدُوْدُ (محبت کرنے والا)
اَلْمَجِيْدُ (بڑی شان والا)

اَلْبَاعِثُ (اٹھانے والا)
اَلشَّهِيْدُ (حاضر)

اَلْحَقُّ (سچا مالک)
اَلْوَكِيْلُ (کام بنانے والا)

اَلْقَوِيُّ (زور آور)
اَلْمَتِيْنُ (قوت والا)

اَلْوَلِيُّ (حمایت کرنے والا)
اَلْحَمِيْدُ (خوبیوں والا)

اَلْمُحْصِيْ (گننے والا)
اَلْمُبْدِئُ (پہلی بار پیدا کرنے والا)

اَلْمُعِيْدُ (دوبارہ پیدا کرنے والا)
اَلْمُحْيِيْ (جلانے والا)

اَلْمُمِيْتُ (مارنے والا)
اَلْحَيُّ (زندہ)

اَلْقَيُّوْمُ (سب کا تھامنے والا)
اَلْوَاجِدُ (پانے والا)

اَلْمَاجِدُ (عزت والا)
اَلْوَاحِدُ (اکیلا)

اَلْاَحَدُ (بے ہمتا)
اَلصَّمَدُ (بے احتیاج)

اَلْقَادِرُ (قدرت والا)
اَلْمُقْتَدِرُ (مقدور والا)

اَلْمُقَدِّمُ (آگے کرنے والا)
اَلْمُؤَخِّرُ (پیچھے کرنے والا)

اَلْاَوَّلُ (سب سے پہلا)
اَلْاٰخِرُ (سب سے آخر)

اَلظَّاهِرُ (ظاہر)
اَلْبَاطِنُ (پوشیدہ)

اَلْوَالِيْ (مالک)
اَلْمُتَعَالِ (بلند صفتوں والا)

اَلْبَرُّ (احسان کرنے والا)
اَلتَّوَّابُ (توبہ قبول کرنے والا)

اَلْمُنْتَقِمُ (بدلہ لینے والا)
اَلْعَفُوُّ (معاف کرنے والا)

اَلرَّءُوْفُ (نرمی کرنے والا)
اَلْغَنِيُّ (بے پرواہ)

ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامُ (عزت اور بخشش والا)
اَلرَّبُّ (پروردگار)

اَلْمُقْسِطُ (انصاف کرنے والا)
اَلْجَامِعُ (اکٹھا کرنے والا)

مَالِكُ الْمُلْكِ (بادشاہی کا مالک)
اَلْمُغْنِيُّ (بے پرواہ کرنے والا)

اَلْمَانِعُ (روکنے والا)
اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانے والا)

اَلنَّافِعُ (نفع پہنچانے والا)
اَلنُّوْرُ (روشن کرنے والا)

اَلْهَادِیْ	(ہدایت کرنے والا)	اَلْبَدِیْعُ	(نئی طرح پیدا کرنے والا)
اَلْبَاقِیْ	(باقی رہنے والا)	اَلْوَارِثُ	(سب کا وارث)
اَلرَّشِیْدُ	(نیک راہ بتانے والا)	اَلصَّبُوْرُ	(صبر کرنے والا)

نبوّت کی حقیقت

نبی وہ شخص ہوتا ہے جو انسان کے اصلی اور حقیقی نصب العین کا علم خدا کی وحی سے براہِ راست حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے اندر اس بات کا ایک زبردست داعیہ محسوس کرتا ہے کہ اس علم کو اپنی تعلیم اور تبلیغ کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچائے۔

انسان کی کوئی قدرتی ضرورت ایسی نہیں ہوتی جس کی تکمیل یا تشفی کے لیے قدرت خود اپنی طرف سے اہتمام نہ کرتی ہو اور پھر قدرت کا یہ اہتمام ایسا نہیں ہوتا کہ انسان اسے ترک کر کے کسی اپنے اہتمام سے اس ضرورت کو پورا کر سکے۔ بلکہ قدرت کا یہ اہتمام اس ضرورت کی صحیح اور پوری تشفی کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

جس طرح سے قدرت انسان کو اس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنی بدنی ضروریات کی تشفی کرے، اس کی اپنی کوشش کے علاوہ بیرونی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے اسی طرح وہ انسان کو اس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنی نفسیاتی یا روحانی ضروریات کی تشفی کرے، اس کی اپنی کوشش کے علاوہ بیرونی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے۔ جس طرح سے قدرت اپنی پیدا کی ہوئی بعض قوتوں مثلاً سورج، بادل، ہوا اور زمین کو بروئے کار لاتی ہے تاکہ انسان ان کی مدد سے غلہ پیدا کر کے اپنی بھوک کو مطمئن کرے اسی طرح وہ مظہر نبوّت کو کارفرما کرتی ہے تاکہ انسان اُس کی معرفت صحیح نصب العین کا علم حاصل کر کے اپنی آرزوئے حسن کو مطمئن کرے۔

جس طرح انسان خود بخود اور قدرت کی اس مدد کے بغیر جو ممدِّ حیات مادی قوتوں کی صورت اختیار کرتی ہے اپنی بھوک کو مطمئن نہیں کر سکتا اسی طرح سے وہ خود بخود اور قدرت کی اُس مدد کے بغیر جو نبوّت کی صُورت اختیار کرتی ہے نصب العین کی آرزو کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

نبوّت انسان کی ایک ایسی ضرورت ہے جو اُس کے لیے زندگی اور موت کی اہمیت رکھتی ہے

تعلیم نبوّت کی مطلق اہمیت اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ نصب العین کے لیے انسان کی آرزو نہ دبائی جا سکتی ہے اور نہ روکی جا سکتی ہے۔ جب ایک انسان اپنی حماقت یا بے پرواہی کی وجہ سے نبوّت کی راہ نمائی سے مستفید نہیں ہوتا اور صحیح نصب العین کی محبّت سے محروم رہ جاتا ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا کہ نصب العین کے لیے اس کی محبّت کا جذبہ رُک جائے یا دب کر ختم ہو جائے بلکہ وہ ایک غلط نصب العین کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے اور جب ایک انسان اس طرح ایک غلط نصب العین سے محبّت کرنے لگ جائے تو وہ بعد میں اس خطرناک اور بے بنیاد محبّت کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک انسان جو اچھی اور صحت بخش غذا نہ پا سکے اپنی بھوک کو روک نہیں سکتا بلکہ جو غذا بھی اسے مل جائے خواہ وہ کیسی ہی مضر صحت اور خطرناک ہو اسی سے اپنا پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں اس غذا کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے سے بچ نہیں سکتا۔

ایک غلط نصبُ العین کو چھوڑ کر دوسرے غلط نصبُ العین سے محبّت کرنا

محض یہ سن لینا یا اطلاع رکھنا کہ فلاں نصبُ العین حسین ہے کسی انسان کے دل میں اُس نصبُ العین کی محبّت پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک نصبُ العین کی محبّت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اُس کے حسن کو فی الواقع محسوس کیا جائے۔ ضروری ہے کہ ایک دریا جس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر دی گئی ہو اپنا راستہ بدلے اور زمین کی اس سطح پر بہنا شروع کر دے جو اس کے پانی کو اپنی خاص بلندی کی وجہ سے قبول کر سکتی ہو خواہ اس کے نتائج کھیتوں اور انسانی آبادیوں کے لیے کچھ ہوں۔ اسی طرح سے جو انسان اپنے صحیح نصب العین کے حسن کو محسوس نہ کر سکے ضروری ہے کہ اس کے جذبہ حسن کا زوردار بہاؤ اپنا فطری راستہ بدل لے اور ایک ایسے تصور حسن کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگ جائے جو حسین تو نہیں لیکن جس کا فرضی حسن وہ اپنی نادانی اور علمی بے مائگی کی وجہ سے اس طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سے بیاباں میں ایک پیاسا سراب کو

پانی سمجھتا ہے۔

ایسے انسان کے ساتھ جو ماجرا پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو اس تصوّر میں حسن کی بعض صفات کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے لہٰذا ان صفات کی کشش کی وجہ سے اور اپنے جذبۂ محبّت کی مکمل تسکین کی غرض سے وہ اس پورے تصوّر کو اپنا نصبُ العین بنا کر اُس سے محبّت کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ نادانستہ طور پر اور پورا غور و فکر کرنے کے بغیر یہ فرض کر لیتا ہے کہ اُس کے اندر وہ تمام صفاتِ حسن موجود ہیں جن کی آرزو اس کی فطرت میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس تصوّر کی طرف حسن کی باقی ماندہ صفات کو (جن کی جھلک اس کو اس تصوّر میں نظر نہیں آئی تھی اور جن کو وہ شعوری طور پر اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتا تھا) غیر شعوری طور پر منسوب کرتا ہے تاکہ اپنی غلطی کو مکمل کر کے اپنی آرزوئے حسن کی تشفی کا سامان پیدا کرے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے غلطی سے صحیح نصب العین یعنی خدا سمجھ لیتا ہے اور لہٰذا اُسے دل و جان سے چاہنے لگتا ہے اور اس سے ویسی ہی محبّت کرتا ہے، اس کی ویسی ہی خدمت کرتا ہے ویسی ہی ستائش کرتا ہے اور ویسی ہی پرستش کرتا ہے جیسی کہ خدا کے لیے ہونی چاہیے۔ قرآن حکیم نے انسان کی فطرت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۂ بقرۃ: رکوع ۲۰)

(لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کو چھوڑ کر اوروں کو معبود بنا لیتے ہیں اور پھر اُن سے ویسی ہی محبّت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہیے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں خدا سے شدید محبّت رکھتے ہیں)

تاہم وقت کے گزرنے سے جب اس تصوّر کے ساتھ اس کا میل جول بڑھتا ہے اور اپنے آپ کے متعلق (یعنی اس بات کے متعلق کہ اس کے جذبہ محبّت کا تسلی بخش اور صحیح مقصود کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہونا چاہیے) اس کا علم ترقی کرتا ہے تو تصوّر کے نقائص اس پر عیاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ نقائص حسن کے ان اوصاف کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور ان کی نفی کرتے ہیں جن کو وہ اس تصوّر کی طرف شعوری طور پر منسوب کر رہا تھا لہٰذا وہ ایک تلخ تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

اس تصور کے اندر جس کو اس نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا، درحقیقت حسن کا کوئی وصف بھی موجود نہیں اور وہ یہ سمجھنے میں غلطی پر تھا کہ اس کو اس تصوّر کے اندر صفاتِ حسن کی کوئی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔

اِس انکشافِ حقیقت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نصب العین کو کلیتہً ترک کر دیتا ہے اور فی الفور ایک اور نصب العین کو اختیار کرتا ہے جو اُس کے خیال میں ان نقائص سے مبرّا ہوتا ہے جو اس کے پہلے نصب العین میں موجود تھے اور اُن صفاتِ حسن سے مزّین ہوتا ہے جو پہلے نصب العین میں موجود نہیں تھے۔ لیکن اگر اس عرصہ میں موافق قسم کی تعلیم یا صحبت پانے کی وجہ سے اس کے دل میں اپنی فطرت کے صحیح نصب العین کے حسُن کا احساس پیدا نہ ہو چکا ہو تو ضروری بات ہے کہ اس کا یہ نیا نصب العین بھی غلط ہو۔ اس صورت میں اگرچہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا نیا نصب العین اِن نقائص سے مبرّا ہے جو اس کے پہلے نصب العین میں موجُود تھے تاہم اس میں بعض اور نقائص موجود ہوتے ہیں جن کا اُسے علم نہیں ہوتا اور یہ نقائص بعد میں اس کی ایک اور کشفِ غطاء اور مایوسی کا باعث ہوتے ہیں۔ تجربہ اور خطا کا یہ عمل جس میں ایک غلط نصب العین کا انتخاب کیا جاتا ہے اس سے والہانہ محبّت کی جاتی ہے۔ اس کے نقائص کا احساس کیا جاتا ہے اُسے ردّ کیا جاتا ہے اور پھر ایک اور غلط نصب العین کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ انسان صحیح نصب العین کا انتخاب نہیں کرتا۔ ایک انسان کے اندازۂ حسن میں ایک نصب العین کا گرنا اور دوسرے کا ابھرنا۔ ایک سی سا کے ایک سرے کے گرنے اور دوسرے سرے کے اُبھرنے کی طرح بیک وقت عمل میں آتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ایک آدمی ایک نصب العین کو چھوڑ چکا ہوتا ہے تو اس وقت وہ دوسرے نصب العین سے محبّت کر رہا ہوتا ہے۔ جب بھی ایک نصب العین کو چھوڑنے اور دوسرے کو اختیار کرنے کے درمیان ایک وقفہ آجائے تو خواہ وہ کتنا ہی مختصر ہو، اس سے انسان کا زوردار جذبۂ محبت رُک جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ صدمہ سے مرجاتا ہے۔ یا کسی شدید قسم کے اعصابی یا دماغی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ذہنی بیماریوں کا سبب انسان کے جذبۂ محبّت کی رکاوٹ ہے۔

خودشعوری یا خودی کی خواہشات ہیں۔

(ب) ان خواہشات سے کوئی حیاتیاتی اضطرار وابستہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ وہ آزاد خواہشات ہیں جو فقط زندگی کی نفسیاتی سطح سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی تشفی کا راستہ جبلّتوں کی طرح حیاتیاتی اعتبار سے معین نہیں ہوتا۔

(ج) ان میں سے ہر خواہش کی تشفی سے ایک خاص قسم کی مسرّت حاصل ہوتی ہے جو اپنی بہترین اور بلند ترین حالت میں اپنی کیفیت اور شدّت کے لحاظ سے اس مسرّت سے بدرجہا افضل ہوتی ہے جو انسان کو جبلّتی خواہشات کی تشفی سے حاصل ہوتی ہے۔

(د) جب یہ اپنی بہترین اور بلند ترین صُورت میں ہوں تو ان کی تشفی خود ان کی تشفی کی خاطر ہی عمل میں لائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور محرک یا مقصود نہیں ہوتا۔

(ہ) ان کا مقصد حسن کی جستجو ہوتا ہے۔ مثلاً نصب العین کی محبّت ہی کو لیجئے۔ نصب العین ایک ایسا تصوّر ہوتا ہے جس کی طرف انسان وہ سارا حسن منسُوب کرتا ہے جو اس کے خیال میں آسکتا ہے۔ اسی طرح سے اخلاقی فعل یا نیکی حسن کے عملی اظہار کا ایک ذریعہ ہے اور علم کی خواہش درحقیقت صداقت یا سچّائی کی خواہش ہے اور صداقت ایک ایسی چیز ہے جسے ہم سراہتے اور پسند کرتے ہیں یعنی جس کی طرف ہم حسن کو منسُوب کرتے ہیں اور فن یا آرٹ کسی واسطہ کے ذریعہ سے حُسن کے اظہار ہی کا نام ہے۔

آرٹ کی ایک عام قسم

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فن یا آرٹ اینٹ، پتھر، آواز، صدا، رنگ، لفظ یا حرکت میں حسن کا اظہار ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لہٰذا وہ ایک ایسا مشغلہ سمجھ لیا گیا ہے جس میں صرف وہ چند افراد ہی حصّہ لے سکتے ہیں جنہوں نے اس غرض کے لیے خاص طور پر تربیّت حاصل کی ہو یا جن کو اس مشغلہ کے لیے قدرت کی طرف سے ایک خاص ملکہ عطا ہوا ہو۔ لیکن آرٹ کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں تمام انسان مساوی طور پر شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں اور وہ طرز بود و باش میں حسن کا اظہار ہے مثلاً جب ہم اپنے مکان کے بنانے اور سجانے میں، اپنے لباس میں، اپنی رفتار و گفتار میں، کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں، دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں، اپنے مادی ماحول کی تخلیق میں اور اپنے تمام

کاموں میں ظاہری طور پر حسن کا اظہار کرتے ہیں تو ہم ایک قسم کے آرٹ میں حصہ لے رہے ہوتے ہیں۔

نصب العین کی خواہش انسان کی تمام دوسری خواہشات پر حکمران ہوتی ہے

نصب العین کی خواہش انسان کی ان تمام خواہشات پر حکومت کرتی ہے جو اس کی زندگی کی نفسیاتی سطح سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کا ذکر معاً اوپر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ان خواہشات میں سے کوئی اپنی اصلی حالت میں اس بڑی خواہش کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو تو وہ اس کو بدل کر ان تقاضوں کے مطابق کر لیتی ہے۔ اوپر عرض کیا گیا تھا کہ اپنی اصلی حالت میں ان خواہشات میں سے ہر خواہش صرف اپنی ہی تشفی چاہتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مقصد (مثلاً کسی دوسری خواہش کی خدمت یا اعانت) نہیں ہوتا۔ لیکن جب نصب العین پوری طرح سے حسین نہ ہو تو پھر ان میں سے کوئی خواہش بھی اپنی اصلی حالت میں اس کے مطابق نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں نصب العین کی خواہش ان میں سے ہر ایک کو بدل کر اپنے مطابق کر لیتی ہے اور یہ تبدیلی غیر شعوری طور پر عمل میں آتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو بالکل علم نہیں ہوتا کہ اس نے ان خواہشات کو اپنے اصلی راستہ سے ہٹا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نصب العین کے چاہنے والوں کا ضابطہ اخلاق اور علم اور آرٹ الگ ہوتا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ نصب العین کی خواہش انسان کی نفسیاتی یا جمالیاتی سطح کی خواہشات پر کیوں حکمران ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان وہ سارا حسن جس کی تمنا اس کی فطرت کے ایک تقاضا کے طور پر اس کے دل میں ہوتی ہے اپنے نصب العین کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ دیکھے کہ اس کی کوئی خواہش اس حسن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تو جب تک وہ اس کو بدل کر اس حسن کے مطابق نہ کرے وہ اسے نہ جوئیے حسن سمجھ سکتا ہے اور نہ درست۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ نصب العین کی خواہش انسان کی نفسیاتی اور جمالیاتی خواہشات پر ہی نہیں بلکہ اس کی جبلتی خواہشات پر بھی حکمران ہے۔ ایک حیوان کے لیے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی جبلتی خواہش کے دباؤ کو روک سکے۔ اس کے برعکس انسان اپنی کسی جبلتی خواہش کی تشفی اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا نصب العین اجازت نہ دے اور وہ اپنی ہر جبلتی خواہش کی تشفی صرف اسی

حد تک کرتا ہے جس حد تک اس کا نصب العین اجازت دیتا ہو۔ جب ایک انسان کا نصب العین یہ تقاضا کرتا ہو کہ وہ اپنی زندگی کو قائم رکھے، تو وہ اس کو قائم رکھنے کے لیے اپنی جبلّتی خواہشات کی مناسب تشفی کے لیے پوری کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب نصب العین کا تقاضا یہ ہو کہ انسان اپنی زندگی کو اس کی حفاظت کے لیے قربان کر کے شہید ہو جائے تو وہ جبلّتی خواہشات کی تشفی سے ہی نہیں بلکہ خود زندگی سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اُسے قربان کرنے کے لیے بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جو ان لاتعداد واقعات کی تشریح کرتی ہے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے نصب العین کی خاطر یہ جانتے ہوئے زندان میں جانا قبول کر لیا ہے کہ وہاں اُسے اپنی جبلّتی ضروریات کو روکنا یا ترک کرنا پڑے گا یا اُسے سخت قسم کی بدنی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے سوائے چارہ نہ ہو گا یا فلاں شخص نے نصب العین کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی ہے یا دار پر چڑھنا یا میدان جنگ میں گولی کھا کر مرجانا قبول کر لیا ہے۔

اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ انسان بالآخر اور درحقیقت صرف ایک ہی خواہش رکھتا ہے اور وہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ تمام نفسیاتی یا جبلّتی خواہشات اس ایک خواہش کے تابع اور اس کی خدمت گزار ہوتی ہیں۔ یہی ایک خواہش اس کے تمام اعمال و افعال کی اصلی اور بنیادی قوّت محرکہ ہوتی ہے اور اس کی فطرت کی کوئی اور قوّت اس کے کسی عمل یا فعل کو پیدا نہیں کرتی۔ یہی خواہش فطرت انسانی کا وہ طاقتور اور زبردست جذبۂ عمل ہے جس کو فرائڈ نے غلطی سے جنسی محبّت کا جذبہ سمجھا ہے۔ جیسے ایڈلر نے نادانی سے قوّت یا غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا جذبہ قرار دیا ہے۔ جس پر میکڈوگل کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ انسان کی جبلّتی یا حیوانی خواہشات کے ایک پُراسرار مرکب کا جذبہ ہے اور جیسے کارل مارکس نے بلا دلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ انسان کی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔

نصب العین کی خواہش اور نوعِ انسانی کی ذہنی اور اخلاقی صحت

اگر نصب العین کی خواہش کسی رکاوٹ یا مایوسی سے دوچار ہو جائے تو انسان کی شخصیت

دب جاتی ہے اور کمزور ہو جاتی ہے اور انسان پریشان اور غمگین ہو جاتا بلکہ بعض وقت شدید قسم کی ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر یہ خواہش مسلسل اور مکمل طور پر مطمئن ہو رہی ہو تو انسان کے لیے ترقی پذیر راحت اور مسرّت کا باعث ہوتی ہے۔ ایک انسان کو جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے محبّت ہوتی ہے۔ اسی قدر زیادہ اُس کی شخصیّت بھی متحد اور جوان اور صحت مند اور توانا اور بلند اور بالا ہوتی ہے۔ اور اسی قدر زیادہ اس کی زندگی کی مسرّت اور راحت اور طمانیت بھی مکمل اور بھرپور ہوتی ہے۔

تاریخ کا مُدعا

لہٰذا جب سے انسان کو اپنے آپ کا شعور حاصل ہوا ہے، انسان ایک ایسے نصبُ العین کی جستجو میں مصرُوف ہے جس کے سامنے وہ مستقل طور پر اور اپنے دل کی پُوری رغبت کے ساتھ اپنی والہانہ محبّت اور خدمت اور اعانت اور ستائش اور پرستش کے نذرانے پیش کر سکے یعنی ایک ایسا نصب العین جو حُسن اور کمال کے بلند ترین اور دائمی اور ابدی اوصاف سے آراستہ ہو تا کہ اس کی محبّت انحطاط اور زوال اور مایوسی کے حادثات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔

بسا اوقات اس قسم کے نصب العین کی جستجو اُسے شدید مصائب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بھیانک حادثات کے روبرو کھڑا کر دیتی ہے اور اس سے بڑی بڑی قربانیوں کی یہاں تک کہ جان کی قربانی کی قیمت وصُول کرتی ہے تاہم وہ اس جستجو کو ترک نہیں کرتا کیونکہ اس کی فطرت کا ایک زبردست اور بے پناہ تقاضا اُسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ اسے ہر حالت میں جاری رکھے خواہ اس کے نتائج کچھ ہوں۔ نوع انسانی کی پُوری تاریخ (اپنے سارے مرحلوں اور شعبوں سمیت خواہ وہ سیاسی ہیں یا اخلاقی یا قانونی یا علمی یا فنی یا اقتصادی یا فوجی)، جس میں جا بجا خوفناک ملک گیر اور عالمگیر جنگوں اور ان گنت انسانوں کی اندوہناک صعوبتوں کے نظارے بھی دکھائی دیتے ہیں فقط ان واقعات کی ایک داستان ہے جو حضرت انسان کو اپنے محبوب نصب العین کی حد درجہ دشوار جستجو کے دُوران شروع سے لے کر آج تک پیش آئے ہیں۔

نصب العین کی عمومی صفات

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان جس نصب العین کی جستجو کر رہا ہے وہ اس کے اندر فی الواقع کون

سے اوصاف کی موجودگی کی توقع کرتا ہے اس سوال کا جواب نصب العین کے لیے انسان کی فطری خواہش کی نوعیت کے اندر پہلے ہی سے موجود ہے کیونکہ یہ خواہش حسن کے لیے ہے وہ صرف ایک ایسے نصب العین سے ہی مطمئن ہو سکتی ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو یعنی

(۱) جو ہر اُس نقص یا عیب سے پاک ہو جس کا ہم انسان ہونے کی حیثیت سے تصوّر کر سکتے ہیں اور

(۲) جس میں وہ تمام اوصاف بدرجہ کمال موجود ہوں جن کو ہم اپنی فطرت کے تقاضوں کی بنا پر عمدہ اور حسین اور قابلِ ستائش اور لائق محبّت سمجھتے ہیں۔

نقص یا عیب محبّت کا دشمن ہے لہٰذا جونہی انسان کو اپنے نصب العین کے اندر کسی چھوٹے سے چھوٹے نقص کی موجودگی کا یا کسی چھوٹی سے چھوٹی خوبی کی عدم موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے اس کی محبّت کافور ہو جاتی ہے بلکہ نفرت میں بدل جاتی ہے۔ بے شک ایک انسان ایک زشت ناقص یا گھٹیا نصب العین سے بھی محبّت کر سکتا ہے اور کرتا ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ وہ اس کی طرف غلطی سے حسن اور کمال کے وہ تمام اوصاف منسوب کر سکے جن کا وہ تصوّر کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دے سکے کہ یہ اوصاف درحقیقت اُس کے اندر موجود ہیں۔

ایک نصب العین کے خصوصی اوصاف

انسان کے نصب العین کے ان عمومی اوصاف سے ہم بڑی آسانی سے اُس کے نصب العین کے خصوصی اور تفصیلی اوصاف کا استنباط کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم ان عمومی اوصاف کی روشنی میں یہ جان سکتے ہیں کہ :۔

(۱) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کا حُسن غیر محدود اور لازوال ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ اس کے نصب العین کے حُسن کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ اس حد سے آگے اُس کا نقص شروع ہو جاتا ہے اور لہٰذا اس کا ایک حصّہ ناقص ہے۔ پھر اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا حُسن عارضی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو جائے گا تو وہ مجبور ہو گا کہ اُسے آج بھی حسن سے محروم سمجھے۔

(۲) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین کوئی ایسی چیز ہو جو زندگی کا وصف رکھتی ہو کیونکہ وہ

کسی ایسی چیز کو اپنا محبوب نہیں بنا سکتا جو بے جان اور مُردہ ہو۔ انسان خود زندہ ہے لہٰذا وہ کسی مردہ چیز سے جو مردہ ہونے کی وجہ سے اس سے گھٹیا اور کمتر درجہ کی ہو محبت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اُس کی ستائش کر سکتا ہے اور نہ خدمت کر سکتا ہے اور نہ اعانت۔ انسان کسی مردہ چیز کی ستائش اس وقت کرتا ہے جب وہ اس کی طرف نادانی سے زندگی کا وصف منسوب کر رہا ہو یا شعوری یا غیر شعوری طور پر اُسے کسی زندہ وجود کا مظہر سمجھ رہا ہو۔ ورنہ مردہ چیز کی خدمت اور اعانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو مردہ چیز کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی خدمت یا اعانت کر رہا ہے اور دوسرے خدمت یا اعانت کرنے والا اس کی خدمت یا اعانت کا نہ کوئی مفہوم معین کر سکتا ہے اور نہ مقصد۔

(۳) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کی زندگی اُس کے حسن کی طرح دائمی ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ وہ مستقبل میں کسی وقت مر کر نیست و نابود ہو جائے گا تو وہ یہ محسوس کرنے کے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ وہ اب بھی ناپائدار ہے اور اب بھی بالقوہ مردہ ہی ہے اور وہ چھوڑ جانے والا دوست ہے جو قابل اعتماد نہیں۔

(۴) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کے اندر زندگی کی وہ تمام خصوصیات بدرجہ کمال موجود ہوں جن کا احساس وہ ایک زندہ وجود کی حیثیت سے اپنی ذات میں کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ وہ سن سکے اور دیکھ سکے، سمجھ سکے، محسوس کر سکے، محبت کر سکے اور محبت کا جواب محبت سے دے سکے۔ انسان کی دنیا کے اندر اس کا کوئی مقصود یا مدعا ہو جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہو اور اس بات کی طاقت رکھتا ہو کہ اس مقصود یا مدعا کو حاصل کرنے کے لیے عمل کر سکے اور اس عمل میں کامیاب ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ضروری ہے کہ وہ بعض آرا اور افعال کو پسند کرتا ہو اور بعض کو ناپسند اور اس بات کی قوت رکھتا ہو کہ وہ جن آرا اور افعال کو پسند کرتا ہے ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کر سکے اور جن کو ناپسند کرتا ہے ان کی مخالفت کر سکے اور ان کو تباہ کر سکے۔ اپنے چاہنے والوں اور مددگاروں کو انعام عطا کر سکے اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سزا دے سکے۔ مختصر طور پر یہ کہ اُس کے اندر محبت اور عدم محبت کے تمام اوصاف موجود ہوں اور وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اُن کا اظہار کر سکے۔ اگر انسان کے نصب العین کے اندر ان اوصاف میں سے کوئی ایک وصف بھی موجود نہ ہو اور انسان کو اس کا علم ہو جائے تو اس کے لیے اپنے نصب العین سے محبت کرنا یا اس کی خدمت اور اعانت

کے لیے کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

محبّت ہمیشہ محبوب کی خدمت کے لیے عمل کا تقاضا کرتی ہے اور یہی عمل اس کی علامت اور اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس عمل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبوب کو خوش کیا جائے اور اس کی محبت یا رضامندی یا پسندیدگی یا قرب کے احساس کی مسرّت حاصل کی جائے۔ ایک نصب العین کو چاہنے کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتے کہ نصب العین کے حصُول کے لیے کام کیا جائے یا جد و جہد کی جائے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچا جائے لیکن اگر انسان کا نصب العین اس قسم کا ہو کہ وہ نہ کسی عمل کو پسند کرتا ہو اور نہ ناپسند، نہ اس کے نزدیک کوئی چیز زشت ہو نہ زیبا نہ حق ہو نہ باطل اور نہ نیک ہو نہ بد۔ دوسرے لفظوں میں انسانی دُنیا کے اندر اس کا کوئی مدعا نہ ہو اور کوئی ایسا مقصد نہ ہو جس میں اس کے چاہنے والے اس سے تعاون کر سکیں تو ایسی حالت میں اس کے چاہنے والے کیونکر جان سکتے ہیں کہ اس کی محبّت کا اظہار کرنے کے لیے اور اس کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے اور اُسے خوش کرنے کے لیے اور اس سے قریب ہونے کے لیے ان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ انسان اپنے نصب العین کی محبّت کا اظہار کرنے کے لیے کوئی کام کرنا چاہتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کام کیا ہے۔ وہ ایسی محبّت سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ جو عمل کی صوُرت اختیار نہ کر سکے اور دل ہی دل میں رہے اور انسان کے عمل کو اوروں کے لیے چھوڑ دے۔ اگر انسان کو معلوم ہو کہ اس کا نصب العین نہ سن سکتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے، نہ محسوس کر سکتا ہے، نہ جان سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے، نہ محبّت اور عمل اور خدمت اور قربانی کی قدر دانی کر سکتا ہے اور نہ محبّت کا جواب محبّت سے دے سکتا ہے تو اس کے چاہنے والوں کے لیے اُن کے خادمانہ افعال اور اعمال کے اندر کوئی کشش باقی نہ رہے گی اور ان کو جاری رکھنے کے لیے کوئی داعیہ موجود نہ رہے گا۔ غور سے دیکھا تو جس چیز کو ایک انسان صحیح سمجھتا ہے وہ انگریزی زبان کی مشہور ضرب المثل کے خلاف کبھی اپنا انعام آپ نہیں ہوتی بلکہ اس کا انعام یہ مسرّت آمیز یقین ہوتا ہے کہ یہ اس کے نصب العین کو جسے وہ ہمیشہ ایک شخص یا شخصیت تصوّر کرتا ہے پسند آتی ہے۔

(۵) ضروری ہے کہ ایک انسان کا نصب العین صاحب قدرت و قوت ہو کیونکہ اگر اسے معلوم ہو کہ اس کا نصب العین اپنے دوستوں اور مددگاروں کو صلہ دینے یا ان پر نوازش کرنے کی قدرت

نہیں رکھتا یا اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سزا دینے سے معذور یا بے بس ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس سے محبّت کرنا یا اس کی خدمت اور اعانت کرنا ایک بے فائدہ مشغلہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا کو اپنے نصب العین کے مطابق لانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہوگا اور بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا رہا ہوگا تو عین اس وقت اس کے مخالفین نہایت آسانی کے ساتھ اور کسی سزا کے خوف سے بے پروا ہو کر اس کے سارے کام کو بگاڑ رہے ہوں گے اور اس کی ساری کوششوں کو خاک میں ملا رہے ہوں گے اس صورت میں وہ یہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین کمزور اور ناتواں ہے اور اس کی محبّت اور پرستش کا حقدار نہیں۔

(۶) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کے اندر نیکی کے اوصاف بھی بدرجہ کمال موجود ہوں کیونکہ یہ اوصاف بھی حسن کے اوصاف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو سراہتے اور پسند کرتے ہیں۔ اگر اُسے معلوم ہو کہ اُن اوصاف میں سے کوئی وصف ایسا ہے جو اُس کے نصب العین میں موجود نہیں تو ضروری بات ہے کہ وہ اس کو ایک نقص قرار دے اور جس حد تک کہ اس کا نصب العین اس وصف سے عاری ہو اُسے حسن سے بھی عاری سمجھے اور اس سے محبّت نہ کر سکے۔

(۷) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین اپنے اوصاف میں بے نظیر اور بے مثال ہو اور کوئی ہمسر یا شریک نہ رکھتا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ سمجھے کہ کوئی اور تصوّر بھی اس کے اوصاف میں شریک ہے تو پھر وہ مجبور ہوگا کہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبّت کرے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کی فطرت کی رُو سے ناممکن ہے۔ کسی انسان کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے اور لہٰذا کوئی انسان بیک وقت دو نصب العینوں سے محبّت نہیں کر سکتا اور پھر حسن کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ بھی بیک وقت دو نصب العینوں میں اپنی حالت کمال پر موجود نہیں ہو سکتا۔

(۸) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین ایسا ہو کہ پوری کائنات کی تخلیق اس کے مدعا کے مطابق ہو۔ دوسرے لفظوں میں ضروری ہے کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر کائنات کے جو قوانین مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں چونکہ اس کے اپنے پیدا کیے ہوئے نہ ہوں گے۔ لہٰذا وہ اس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدعا کے ساتھ متصادم ہوں گے یا پوری طرح سے ہم آہنگ نہ ہوں گے لہٰذا وہ اور اس کا نصب العین

دونوں اس قابل نہ ہوسکیں گے کہ اپنے اس مدّعا کو حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ سمجھے گا کہ کائنات جس میں وہ بھی شامل ہے خود بخود وجود میں آگئی ہے اور خود بخود قائم ہے اور اس پر اور اس کی اپنی ذات پر اس کے نصب العین کا کوئی اختیار یا تصرف نہیں تو وہ سمجھے گا کہ اُس کے نصب العین کی حیثیت اگر اس کی اپنی ذات سے کم نہیں تو اس سے زیادہ بھی نہیں اور لہٰذا وہ اس بات کی ضرورت محسوس نہ کرے گا کہ وہ اس سے محبّت کرے اس کی ستائش کرے یا اس کی خدمت کیلئے جانفشانیاں کرے۔

انسان کے نصب العین کی محولہ بالا دو عمومی اور بنیادی صفات کے اندر اور بہت سی صفات مضمر ہیں جن کا ہم اسی طرح ان صفات سے استخراج کر سکتے ہیں۔ چونکہ انسان کی فطرت کی رُو سے یہی وہ صفات ہیں جو انسان اپنے نصب العین کے اندر موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا خواہ اس کا نصب العین کچھ ہو۔ ایک پتھر ہو یا ایک درخت ہو یا دریا ہو یا پہاڑ یا ایک بُت ہو یا قوم یا نسل یا وطن یا ایک نظریہ یا ازم، وہ ان صفات کو اپنے نصب العین کی طرف ہر حالت میں منسُوب کرتا ہے۔ بعض کو شعوری اور دانستہ طور پر اور بعض کو غیر شعوری اور نادانستہ طور پر۔ مثلاً خواہ انسان کا نصب العین کوئی مادی چیز ہو یا کوئی تصوّر، اس کا چاہنے والا اس کے ساتھ اس طرح سے برتاؤ کرتا ہے کہ گویا وہ ایک شخصیّت ہے جس میں زندگی، قوّت، حسُن، نیکی اور صداقت کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو اس کے لیے ممکن بناتی ہے کہ وہ اس سے محبّت کرے اور اس کی ستائش اور پرستش کرے اور اس کی خدمت کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائے۔

نصب العین کی محبّت کا جذبہ اور حقیقتِ کائنات

اب غور فرمائیے کہ ایک طرف سے تو انسان کے اندر ایک ایسے نصب العین کی محبّت کا زبردست جذبہ موجود ہے جو خالق کائنات ہو اور بدرجہ کمال حسُن، نیکی، صداقت اور قوّت کی صفات کا مالک ہو اور دوسری طرف سے کائنات کی کوئی تشریح اس سے زیادہ قابل یقین اور حقائق معلومہ اور مسلّمہ کے مطابق نہیں کہ کائنات کی حقیقت ایک ایسا وجود ہے جس نے اُسے پیدا کیا ہے اور جو بدرجہ کمال حسُن، نیکی، صداقت اور قوّت کی صفات کا مالک ہے اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ نصب العین جسے نوع انسانی تاریخ کی کٹھن منزلوں میں تلاش کر رہی ہے (یعنی انسان کا صحیح

نصب العین) خود حقیقت کائنات کے سوائے اور کوئی نہیں۔ یہ ہے وہ ناقابل انکار اور عظیم الشان صداقت جسے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں اور جس پر وہ زور دیتے ہیں۔ ہر نبی جو دنیا میں آیا اس کی دعوت کی ابتداء اور انتہا یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: لا اِلٰہ الا اللّٰہ۔ خدا کے سوائے کوئی نہیں جو (اپنی صفات کی بناپر) تمہاری محبّت، ستائش، پرستش اور خدمت کا حق دار ہو۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم نے اعلان فرمایا تھا:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ

اے لوگو اپنے پرورد گار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی پیدا کیا تھا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

اسلام اور حقیقتِ کائنات کی صفات

قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم خدا کے لیے اللہ کا نام استعمال کریں یا رحمٰن کا یا کوئی اور نام۔ جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ تمام حسین نام صرف اُس کے ہیں اور کسی دوسرے کے نہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

"اُسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔ خواہ تم اُسے کسی نام سے پکارو (لیکن یاد رکھو کہ) تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔"

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ

"اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں پس ان ناموں سے اُسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارہ میں الحاد سے کام لیتے ہیں۔"

جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے سو اہم نام گنائے ہیں جو نیچے درج کیے جاتے ہیں:-

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ ــــ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ

وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں

اَلرَّحْمٰنُ (بہت مہربان) اَلرَّحِیْمُ (نہایت رحم والا)

اَلْمَلِكُ (بادشاہ) — اَلْقُدُّوْسُ (پاک ذات)

اَلسَّلَامُ (سلامتی والا) — اَلْمُؤْمِنُ (امن دینے والا)

اَلْمُهَيْمِنُ (نگرانی کرنے والا) — اَلْعَزِيْزُ (غالب)

اَلْجَبَّارُ (زبردست) — اَلْمُتَكَبِّرُ (بڑائی والا)

اَلْخَالِقُ (بنانے والا) — اَلْبَارِئُ (پیدا کرنے والا)

اَلْمُصَوِّرُ (صورت بنانے والا) — اَلْغَفَّارُ (بخشنے والا)

اَلْقَهَّارُ (دباؤ والا) — اَلْوَهَّابُ (بہت دینے والا)

اَلرَّزَّاقُ (روزی دینے والا) — اَلْفَتَّاحُ (کھولنے والا)

اَلْعَلِيْمُ (جاننے والا) — اَلْقَابِضُ (تنگ کرنے والا)

اَلْبَاسِطُ (کشادہ کرنے والا) — اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا)

اَلرَّافِعُ (بلند کرنے والا) — اَلْمُعِزُّ (عزت دینے والا)

اَلْمُذِلُّ (ذلیل کرنے والا) — اَلسَّمِيْعُ (سننے والا)

اَلْبَصِيْرُ (دیکھنے والا) — اَلْحَكَمُ (فیصلہ کرنے والا)

اَلْعَدْلُ (انصاف کرنے والا) — اَللَّطِيْفُ (مہربان)

اَلْخَبِيْرُ (خبردار) — اَلْحَلِيْمُ (بردبار)

اَلْغَفُوْرُ (بخشنے والا) — اَلشَّكُوْرُ (قدردان)

اَلْعَظِيْمُ (عظمت والا) — اَلْعَلِيُّ (بلندی والا)

اَلْكَبِيْرُ (بڑائی والا) — اَلْحَفِيْظُ (حفاظت کرنے والا)

اَلْمُقِيْتُ (روزی پہنچانے والا) — اَلْحَسِيْبُ (کفایت کرنے والا)

اَلْجَلِيْلُ (بزرگی والا) — اَلْكَرِيْمُ (عزت والا)

اَلرَّقِيْبُ (نگہبان) — اَلْمُجِيْبُ (قبول کرنے والا)

اَلْوَاسِعُ (کشائش والا) — اَلْحَكِيْمُ (حکمت والا)

اَلْوَدُوْدُ (محبت کرنے والا) — اَلْمَجِيْدُ (بڑی شان والا)

اَلْبَاعِثُ	(اٹھانے والا)	اَلشَّهِيْدُ	(حاضر)
اَلْحَقُّ	(سچّا مالک)	اَلْوَكِيْلُ	(کام بنانے والا)
اَلْقَوِيُّ	(زور آور)	اَلْمَتِيْنُ	(قوّت والا)
اَلْوَلِيُّ	(حمایت کرنے والا)	اَلْحَمِيْدُ	(خوبیوں والا)
اَلْمُحْصِيُ	(گننے والا)	اَلْمُبْدِئُ	(پہلی بار پیدا کرنے والا)
اَلْمُعِيْدُ	(دوبارہ پیدا کرنے والا)	اَلْمُحْيِيُ	(جلانے والا)
اَلْمُمِيْتُ	(مارنے والا)	اَلْحَيُّ	(زندہ)
اَلْقَيُّوْمُ	(سب کا تھامنے والا)	اَلْوَاجِدُ	(پانے والا)
اَلْمَاجِدُ	(عزّت والا)	اَلْوَاحِدُ	(اکیلا)
اَلْاَحَدُ	(بے ہمتا)	اَلصَّمَدُ	(بے احتیاج)
اَلْقَادِرُ	(قدرت والا)	اَلْمُقْتَدِرُ	(مقدور والا)
اَلْمُقَدِّمُ	(آگے کرنے والا)	اَلْمُؤَخِّرُ	(پیچھے کرنے والا)
اَلْاَوَّلُ	(سب سے پہلا)	اَلْاٰخِرُ	(سب سے آخر)
اَلظَّاهِرُ	(ظاہر)	اَلْبَاطِنُ	(پوشیدہ)
اَلْوَالِيُ	(مالک)	اَلْمُتَعَالُ	(بلند صفتوں والا)
اَلْبَرُّ	(احسان کرنے والا)	اَلتَّوَّابُ	(توبہ قبول کرنے والا)
اَلْمُنْتَقِمُ	(بدلہ لینے والا)	اَلْعَفُوُّ	(معاف کرنے والا)
اَلرَّءُوْفُ	(نرمی کرنے والا)	اَلْغَنِيُّ	(بے پرواہ)
ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامُ	(عزّت اور بخشش والا)	اَلرَّبُّ	(پروردگار)
اَلْمُقْسِطُ	(انصاف کرنے والا)	اَلْجَامِعُ	(اکٹھا کرنے والا)
مَالِكُ الْمُلْكِ	(بادشاہی کا مالک)	اَلْمُغْنِيُّ	(بے پرواہ کرنے والا)
اَلْمَانِعُ	(روکنے والا)	اَلضَّارُّ	(نقصان پہنچانے والا)
اَلنَّافِعُ	(نفع پہنچانے والا)	اَلنُّوْرُ	(روشن کرنے والا)

اَلْھَادِیْ	(ہدایت کرنے والا)	اَلْبَدِیْعُ	(نئی طرح پیدا کرنے والا)
اَلْبَاقِیْ	(باقی رہنے والا)	اَلْوَارِثُ	(سب کا وارث)
اَلرَّشِیْدُ	(نیک راہ بتانے والا)	اَلصَّبُوْرُ	(صبر کرنے والا)

نبوّت کی حقیقت

نبی وہ شخص ہوتا ہے جو انسان کے اصلی اور حقیقی نصب العین کا علم خدا کی وحی سے براہِ راست حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے اندر اس بات کا ایک زبردست داعیہ محسوس کرتا ہے کہ اس علم کو اپنی تعلیم اور تبلیغ کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچائے۔

انسان کی کوئی قدرتی ضرورت ایسی نہیں ہوتی جس کی تکمیل یا تشفی کے لیے قدرت خود اپنی طرف سے اہتمام نہ کرتی ہو اور پھر قدرت کا یہ اہتمام ایسا نہیں ہوتا کہ انسان اسے ترک کر کے کسی اپنے اہتمام سے اس ضرورت کو پورا کر سکے۔ بلکہ قدرت کا یہ اہتمام اس ضرورت کی صحیح اور پوری تشفی کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

جس طرح سے قدرت انسان کو اس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنی بدنی ضروریات کی تشفی کرے، اس کی اپنی کوشش کے علاوہ بیرونی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے اسی طرح وہ انسان کو اس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنی نفسیاتی یا روحانی ضروریات کی تشفی کرے، اس کی اپنی کوشش کے علاوہ بیرونی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے۔ جس طرح سے قدرت اپنی پیدا کی ہوئی بعض قوتوں مثلاً سورج، بادل، ہوا اور زمین کو بروئے کار لاتی ہے تاکہ انسان ان کی مدد سے غلّہ پیدا کر کے اپنی بھوک کو مطمئن کرے اسی طرح وہ مظہر نبوّت کو کارفرما کرتی ہے تاکہ انسان اُس کی معرفت صحیح نصب العین کا علم حاصل کر کے اپنی آرزوئے حسن کو مطمئن کرے۔

جس طرح انسان خود بخود اور قدرت کی اس مدد کے بغیر جو ممدِ حیات مادی قوتوں کی صورت اختیار کرتی ہے اپنی بھوک کو مطمئن نہیں کر سکتا اسی طرح سے وہ خود بخود اور قدرت کی اُس مدد کے بغیر جو نبوّت کی صورت اختیار کرتی ہے نصب العین کی آرزو کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

نبوّت انسان کی ایک ایسی ضرورت ہے جو اُس کے لیے زندگی اور موت کی اہمیت رکھتی ہے

تعلیم نبوت کی مطلق اہمیت اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ نصب العین کے لیے انسان کی آرزو نہ دبائی جاسکتی ہے اور نہ روکی جاسکتی ہے۔ جب ایک انسان اپنی حماقت یا بے پرواہی کی وجہ سے نبوت کی راہ نمائی سے مستفید نہیں ہوتا اور صحیح نصب العین کی محبت سے محروم رہ جاتا ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا کہ نصب العین کے لیے اس کی محبت کا جذبہ رُک جائے یا دب کر ختم ہو جائے بلکہ وہ ایک غلط نصب العین کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے اور جب ایک انسان اس طرح ایک غلط نصب العین سے محبت کرنے لگ جائے تو وہ بعد میں اس خطرناک اور بے بنیاد محبت کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک انسان جو اچھی اور صحت بخش غذا نہ پا سکے اپنی بھوک کو روک نہیں سکتا بلکہ جو غذا بھی اسے مل جائے خواہ وہ کیسی ہی مضر صحت اور خطرناک ہو اسی سے اپنا پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں اس غذا کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے سے بچ نہیں سکتا۔

ایک غلط نصبُ العین کو چھوڑ کر دوسرے غلط نصبُ العین سے محبّت کرنا

محض یہ سن لینا یا اطلاع رکھنا کہ فلاں نصبُ العین حسین ہے کسی انسان کے دل میں اُس نصبُ العین کی محبّت پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک نصبُ العین کی محبّت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اُس کے حسن کو فی الواقع محسوس کیا جائے۔ ضروری ہے کہ ایک دریا جس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر دی گئی ہو اپنا راستہ بدلے اور زمین کی اس سطح پر بہنا شروع کر دے جو اس کے پانی کو اپنی خاص بلندی کی وجہ سے قبول کر سکتی ہو خواہ اس کے نتائج کھیتوں اور انسانی آبادیوں کے لیے کچھ ہوں۔ اسی طرح سے جو انسان اپنے صحیح نصب العین کے حسن کو محسوس نہ کر سکے ضروری ہے کہ اس کے جذبۂ حسن کا زوردار بہاؤ اپنا فطری راستہ بدل لے اور ایک ایسے تصورِ حسن کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگ جائے جو حسین تو نہیں لیکن جس کا فرضی حسن وہ اپنی نادانی اور علمی بے مائگی کی وجہ سے اس طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سے بیاباں میں ایک پیاسا سراب کو

پانی سمجھتا ہے۔

ایسے انسان کے ساتھ جو ماجرا پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو اس تصوّر میں حسن کی بعض صفات کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے لہٰذا ان صفات کی کشش کی وجہ سے اور اپنے جذبۂ محبّت کی مکمل تسکین کی غرض سے وہ اس پورے تصوّر کو اپنا نصب العین بنا کر اس سے محبّت کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ نادانستہ طور پر اور پورا غور و فکر کرنے کے بغیر یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس کے اندر وہ تمام صفاتِ حسن موجود ہیں جن کی آرزو اس کی فطرت میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس تصوّر کی طرف حسن کی باقی ماندہ صفات کو (جن کی جھلک اس کو اس تصوّر میں نظر نہیں آئی تھی اور جن کو وہ شعوری طور پر اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتا تھا) غیر شعوری طور پر منسوب کرتا ہے تاکہ اپنی غلطی کو مکمل کر کے اپنی آرزوئے حسن کی تشفی کا سامان پیدا کرے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے غلطی سے صحیح نصب العین یعنی خدا سمجھ لیتا ہے اور لہٰذا اسے دل و جان سے چاہنے لگتا ہے اور اس سے ویسی ہی محبّت کرتا ہے، اس کی ویسی ہی خدمت کرتا ہے ویسی ہی ستائش کرتا ہے اور ویسی ہی پرستش کرتا ہے جیسی کہ خدا کے لیے ہونی چاہیے۔ قرآن حکیم نے انسان کی فطرت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۂ بقرۃ : رکوع ۲۰)

(لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کو چھوڑ کر اوروں کو معبود بنا لیتے ہیں اور پھر ان سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہیے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں)

تاہم وقت کے گزرنے سے جب اس تصوّر کے ساتھ اس کا میل جول بڑھتا ہے اور اپنے آپ کے متعلق (یعنی اس بات کے متعلق کہ اس کے جذبۂ محبّت کا تسلی بخش اور صحیح مقصود کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہونا چاہیے) اس کا علم ترقی کرتا ہے تو تصوّر کے نقائص اس پر عیاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ نقائص حسن کے ان اوصاف کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور ان کی نفی کرتے ہیں جن کو وہ اس تصوّر کی طرف شعوری طور پر منسوب کر رہا تھا لہٰذا وہ ایک تلخ تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

اس تصور کے اندر جس کو اس نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا، درحقیقت حسن کا کوئی وصف بھی موجود نہیں اور وہ یہ سمجھنے میں غلطی پر تھا کہ اس کو اس تصوّر کے اندر صفاتِ حسن کی کوئی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔

اِس انکشافِ حقیقت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نصب العین کو کلیتہً ترک کر دیتا ہے اور فی الفور ایک اور نصب العین کو اختیار کرتا ہے جو اُس کے خیال میں ان نقائص سے مبرّا ہوتا ہے جو اس کے پہلے نصب العین میں موجود تھے اور اُن صفاتِ حسن سے مزیّن ہوتا ہے جو پہلے نصب العین میں موجود نہیں تھے۔ لیکن اگر اس عرصہ میں موافق قسم کی تعلیم یا صحبت پانے کی وجہ سے اس کے دل میں اپنی فطرت کے صحیح نصب العین کے حسُن کا احساس پیدا نہ ہو چکا ہو تو ضروری بات ہے کہ اس کا یہ نیا نصب العین بھی غلط ہو۔ اس صورت میں اگرچہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا نیا نصب العین اِن نقائص سے مبرّا ہے جو اس کے پہلے نصب العین میں موجُود تھے تاہم اس میں بعض اور نقائص موجود ہوتے ہیں جن کا اُسے علم نہیں ہوتا اور یہ نقائص بعد میں اس کی ایک اور کشفِ غطاء اور مایوسی کا باعث ہوتے ہیں۔ تجربہ اور خطا کا یہ عمل جس میں ایک غلط نصب العین کا انتخاب کیا جاتا ہے اس سے والہانہ محبّت کی جاتی ہے۔ اس کے نقائص کا احساس کیا جاتا ہے اُسے ردّ کیا جاتا ہے اور پھر ایک اور غلط نصب العین کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ انسان صحیح نصب العین کا انتخاب نہیں کرتا۔ ایک انسان کے اندازۂ حسن میں ایک نصب العین کا گرنا اور دوسرے کا ابھرنا۔ ایک سی سل کے ایک سرے کے گرنے اور دوسرے سرے کے اُبھرنے کی طرح بیک وقت عمل میں آتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ایک آدمی ایک نصب العین کو چھوڑ چکا ہوتا ہے تو اس وقت وہ دوسرے نصب العین سے محبّت کر رہا ہوتا ہے۔ جب بھی ایک نصب العین کو چھوڑنے اور دوسرے کو اختیار کرنے کے درمیان ایک وقفہ آجائے تو خواہ وہ کتنا ہی مختصر ہو، اس سے انسان کا زوردار جذبۂ محبت رُک جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ صدمہ سے مر جاتا ہے۔ یا کسی شدید قسم کے اعصابی یا دماغی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ذہنی بیماریوں کا سبب انسان کے جذبۂ محبّت کی رکاوٹ ہے۔

وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (الاعراف: ۱۷۹)

ان کے دل ہیں جن سے سوچتے نہیں اور اُن کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے کان ہیں جن سے سنتے نہیں۔ وہ حیوانات کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہی لوگ ہیں جو اپنی گمراہی سے بھی بے خبر ہیں۔

چونکہ نصب العین انسان کے ہر فعل کا سرچشمہ ہے اور اس کی قدر و قیمت کو معین کرتا ہے لہٰذا انسان کا ہر فعل اتنا ہی اچھا یا بُرا ہوتا ہے جتنا کہ وہ نصب العین اچھا یا بُرا ہوتا ہے جس سے وہ صادر ہوتا ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ اس شخص کا کیرکٹر بھی حقیقی طور پر عمدہ یا بلند نہیں ہو سکتا جو ایک ناقص اور غلط نصب العین سے محبت کر رہا ہو۔ مثلاً جس شخص کا نصب العین کوئی قوم ہو جو کسی خاص خطہ زمین میں بس رہی ہو اور اپنے چمڑے کی ایک خاص رنگت رکھتی ہو اور ایک خاص نسل سے تعلق رکھتی ہو اور ایک خاص زبان بولتی ہو۔ اس کا تصوّر صداقت یا عدل یا حریت یا مساوات کبھی اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ اُن لوگوں پر بھی حاوی ہو جائے جو اس ملک یا رنگ یا نسل یا زبان سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ صداقت، عدل، حریت یا مساوات کا کوئی ایسا تصوّر اس کی محبت یا کوشش کے لائق نہیں جو اس کی اپنی قوم کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو فائدہ پہنچاتا ہو یا اس کی اپنی قوم کے مفاد کی قیمت پر کسی دوسری قوم کی عظمت کا اہتمام کرتا ہو۔

خدا کی محبت صرف ایک ہی سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی اقدار کی محبت جو انسان کی فطرت میں ہے وہ قوت حاصل کر سکتی ہے جو ان اقدار کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ جو شخص کسی غلط اور ناقص نصب العین سے محبّت کر رہا ہو وہ بھی ہمہ گیر اخلاقی اصولوں سے مطابقت رکھنے والے عمدہ اخلاقی عمل کی فطری خواہش تو رکھتا ہے لیکن اس کی یہ خواہش اس کی غلط محبّت سے دب جاتی ہے اور لہٰذا وہ اس کے تقاضوں کا صحیح ادراک یا اُن کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف غلط نصب العینوں کے چاہنے والے اس بات پر اتفاق نہیں کر سکتے کہ صداقت، عدل، حریت اور مساوات ایسی اصطلاحات کا صحیح مفہوم کیا ہے اور وہ کس قسم کے عمل کا تقاضا کرتی ہیں اور ایسی حالت میں جب کہ وہ ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ نہایت اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ ان اخلاقی

اقدار کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قربانیاں پیش کر رہے ہیں جن پر یہ اصطلاحات دلالت کرتی ہیں۔

غلط اور ناقص نصب العین کی محبّت نہ مکمّل ہو سکتی ہے اور نہ مستقل طور پر قائم رہ سکتی ہے

(۲) ایک ایسے شخص کی محبت جو کسی غلط اور ناقص نصب العین کو اختیار کر لیتا ہے نہ تو اپنے مکمل کمال پر پہنچ سکتی ہے اور نہ ہی تادیر قائم رہ سکتی ہے۔ کامل اس لیے نہیں ہو سکتی کہ وہ حسن، خیر اور صداقت کے لیے اس کے فطری جذبہ محبت سے جو اسے مطلق اور عالمگیر اخلاقی اصولوں کے مطابق عمل پر اکساتی ہے مطابقت نہیں رکھتی اور اندر ہی اندر اس کے ساتھ متصادم ہوتی رہتی ہے لہٰذا وہ اپنی غلط محبت کی وجہ سے اپنے اس فطری جذبۂ محبت کی مکمل تشفی نہیں کر سکتا اس کے علاوہ حسن کے وہ اوصاف جن کی موجودگی کا وہ شعوری احساس نہیں رکھتا اور جن کو وہ اس کی طرف فقط اپنی غلطی کو مکمل کرنے کے لیے بلاوجہ اور غیر شعوری طور پر منسوب کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی محبت کی نشوونما میں ایک رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور اسے ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ لہٰذا وہ اپنے غلط نصب العین کے ساتھ دل و جان سے محبت نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے ایک مخفی غیر شعوری نفرت جو بعد میں آشکار اور باشعور ہو جاتی ہے اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی غیر مطمئن رہتی ہے اور وہ بہت جلد خوف، غم، پریشانی بلکہ ہسٹیریا۔ ذہنی مجادلہ اور دوسرے اعصابی امراض میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا (آل عمران: ۱۵۱)

عنقریب ہم کافروں کے دلوں میں خوف پیدا کر دیں گے اس بنا پر کہ انہوں نے اس چیز کو خدا کا شریک ٹھہرایا جس کے لیے اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی تھی۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (طٰہٰ: ۱۲۴)

جس شخص نے میرے ذکر سے رُوگردانی کی اُسے ایک دشوار زندگی کا سامنا کرنا ہوگا
اور ہم قیامت کے دن بھی اُسے اندھا بنا کر اُٹھائیں گے۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ○ (الزخرف: ۳۶)

جو شخص خدا کے ذکر سے منہ موڑ لیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں
جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حسن سے محبت کرنے کے یہ دونوں طریقے (جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے (یعنی نصب العین کے حسن پر غور و فکر اور نصب العین کے حصول کے لیے عمل) ایک غلط نصب العین کی محبت کو بھی کچھ عرصہ کے لیے ترقی دیتے ہیں لیکن اس کی ترقی جلد ہی ایک مقام پر پہنچ جاتی ہے جس سے آگے نہیں جا سکتی بلکہ یہاں پہنچ کر یہ طریقے اس کی محبت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس کے نقائص کو آشکار کرنے اور اس کی نفرت پیدا کرنے اور اسے ترقی دینے کا نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔

ایک غلط نصب العین زود یا بدیر فرد اور قوم کی زندگی کے ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں

(۳) ایک غلط نصب العین کے نازیبا اوصاف جو اس کو چاہنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود ان کے اعمال کی نوعیت کو معین کرتے رہتے ہیں ان کی زندگی کے خارجی حالات کے آئینے میں آشکار ہو جاتے ہیں؛ اس لیے ایک غلط نصب العین ایسے قومی اور بین الاقوامی حالات پیدا کرتا ہے جو انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں کو مصیبت اور پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ایک غلط نصب العین دراصل ہر پہلو سے اور مکمل طور پر ناکام ہوتا ہے کیونکہ وہ زندگی کے خارجی حالات میں حسن کے ان اوصاف کو بھی آشکار نہیں کر سکتا جو اس کے چاہنے والے اس کی طرف شعوری طور پر اور دیدہ دانستہ منسوب کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ نصب العین کے وہ نقائص جو اس کی فطرت میں مضمر ہوتے ہیں ان اوصاف کے ساتھ ٹکراتے ہیں اوران کے کامیاب عملی خارجی اظہار کو ناممکن بنا دیتے ہیں۔

جنگ جوئی اور خون ریزی کا اصل سبب

(۴) صیحح اور سچا نصب العین صرف خدا ہے جو ایک ہے لیکن غلط اور جھوٹے نصب العین جو انسان کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتے لاتعداد ہیں اوران میں سے بہت سے بیک وقت ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو موجود ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان غلط نصب العینوں میں سے ہر ایک اپنا ایک ضابطۂ اخلاق وعمل رکھتا ہے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے غیر محدود قوّت اور توسیع کا متمنی ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا ضابطۂ اخلاق وعمل پوری دنیا میں قبول کر لیا جائے۔ لہٰذا ہر نصب العینی جماعت دوسری تمام نصب العینی جماعتوں کے خلاف برسرپیکار ہو جاتی ہے اور تمام نصب العینی جماعتیں ایک غیر متناہی جنگ میں اُلجھ جاتی ہیں اور جوں جوں انسانوں کو بڑی تعداد میں ہلاک کرنے کے آلات قوّت اور اثر میں ترقی کرتے جاتے ہیں نصب العینوں کی یہ غیر متناہی جنگ بھی زیادہ سے زیادہ انسانوں کی خون ریزی اور تباہی کا سبب بنتی جاتی ہے

جو قوم غلط نصب العین پر قائم ہوتی ہے اس کا آخر کار مٹ جانا ضروری ہوتا ہے

(۵) وہ قوم جو کسی غلط نصب العین کی محبت پر قائم ہو تادیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہے کہ وہ کئی صدیوں تک زندہ رہے لیکن فطرت انسانی کے ناقابل تغیر قوانین کے عمل کی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ آخر کار نیست و نابود ہو کر رہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ج اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ

(یونس: ۴۹)

ہر قوم کے لیے جو کسی غلط نصب العین کی پرستار ہو ایک مدت حیات ہوتی ہے جب ان کی موت ختم ہونے کا لمحہ آتا ہے تو وہ نہ اس کے پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے نکلتے ہیں۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِنِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ

الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ (ابراہیم: ۲۶)

ایک ناپاک کلمے یعنی ایک ناپاک اعتقاد یا نصب العین کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک نابکار درخت جسے زمین سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور اسے کوئی ثبات یا قرار نہیں ہوتا۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَیْتًا ط وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۴۱)

ان لوگوں کی مثال جو خدا کو چھوڑ اوروں کو یعنی اور نصب العینوں کو دوست بناتے ہیں ایک مکڑی کی طرح ہے جو اپنے لیے گھر بناتی ہے اور یقیناً سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا ہی گھر ہوتا ہے کاش کہ یہ لوگ جانتے۔

لہٰذا وہ ساری قربانیاں جو ایک غلط نصب العین کے پرستار اس کے لیے کرتے ہیں، رائیگاں جاتی ہیں وہ مجبور ہوتے ہیں کہ خود اپنے ہاتھوں سے عمارت کو ڈھائیں اور برباد کریں جسے وہ صدیوں کی محنت شاقہ کے بعد کھڑا کرنے کے قابل ہوئے کیونکہ انہوں نے نہیں دیکھا تھا کہ اس عمارت کی دیواریں ٹیڑھی ہیں اور وہ ان کے ذوق حسن کو مطمئن نہیں کر سکے گی اور ان کے کسی کام نہیں آسکے گی۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک بڑھیا جو بڑی محنت اور بڑے شوق سے سوت کاتتی ہے اور پھر جب کات لیتی ہے تو اپنے ہی ہاتھوں سے اُسے نوچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْکَاثًا (النحل: ۹۲)

اس عورت کی طرح نہ بنو جو اپنے سوت کو مضبوطی سے کاتنے کے بعد کھول کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

یہ لوگ جب تک اپنے غلط نصب العین کی خدمت میں قربانیاں پیش کر رہے ہوتے ہیں تو کسی کی پند و نصیحت سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں بالکل درست ہے لیکن درحقیقت وہ اپنی زندگی کو ضائع کر رہے ہوتے ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝

کہیے کیا میں تم کو ان لوگوں کا حال بتاؤں جن کے اعمال سب سے زیادہ نقصان رساں ہیں
یہ لوگ وہ ہیں جن کی تگ ودو اس دنیا کی زندگی کے لیے صرف ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے
باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نہایت اچھے کام کر رہے ہیں۔

(الکہف: ۱۰۳، ۱۰۴)

وہ اپنے نصب العین سے مخلصانہ اور والہانہ محبت کرتے ہیں لیکن اس کا انجام فقط یہ ہوتا ہے کہ وہ نصب العین انہیں فریب دے کر چھوڑ جاتا ہے اور ان کو اپنی غلط محبت کی قیمت اپنی جان سے ادا کرنی پڑتی ہے اور اس کے عوض میں وہ فقط تباہی اور بربادی کو مول لیتے ہیں۔ قرآن حکیم بار بار ایسی قوموں کا ذکر کرتا ہے جن کو دنیا سے اس لیے رخصت ہونا پڑا کہ وہ خدا کو چھوڑ کر غلط نصب العینوں سے محبت کرتے تھے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ○ (الرّوم: ۴۲)

کہیے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا ہے جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور جو خدا سے شرک کیا کرتے تھے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ○ (الانعام: ۶)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کر دیا ہے جن کو ہم نے زمین پر اس طرح سے تمکن کیا تھا کہ تم کو بھی ویسا نہیں کیا اور ہم نے ان پر آسمان سے موسلا دھار مینہ برسائے اور دریاؤں کو ان کے قدموں پر جاری کیا پس ہم نے اُن کو اُن کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد اور نسلوں کو پیدا کر دیا۔

غلط نصب العین پر قائم ہونے والی ریاست میں سچّی آزادی ممکن نہیں

(۶) ایک ایسی ریاست جو کسی غلط نصب العین پر مبنی ہو فرد کو سچّی آزادی نہیں دے سکتی۔ ایسی ریاست میں فرد ظاہری طور پر آزاد ہوتا ہے لیکن دراصل وہ ریاست کے غلط نصب العین کا غلام ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اپنی غلط تعلیم کی وجہ سے وہ اپنے غلط نصب العین کو پسند کرنے لگ جاتا ہے اور اپنی غلامی کو آزادی سمجھ کر اس سے پوری طرح رضامند ہو جاتا ہے اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے نصب العین کا غلام بن گیا ہے جو اس کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا اور اُسے اپنے غیر فطری اور غلط ضابطۂ اخلاق کی پیروی پر مجبور کر رہا ہے۔

اگر آزادی کا کوئی مطلب ہو سکتا ہے تو وہ سوائے اس کے کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ کوئی انسان اپنی اس آرزو کو مطمئن کرنے کے لیے مکمل اور مستقل طور پر آزاد ہے جو آخر کار اس کی فطرت کی صرف ایک ہی آرزو ہے اور یہ آرزو خدا کی آرزو ہے۔ ان بیرونی قوتوں میں جو اس آزادی کے ساتھ مزاحمت کرتی ہیں، نہ صرف غلط نصب العین پر قائم ہونے والی ریاست کا قانون شامل ہوتا ہے جو اسے اس کی فطرت کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ وہ نظامِ تعلیم (جس میں سماجی ماحول بھی داخل ہے) بھی شامل ہوتا ہے جو اسے نادانستہ طور پر ایسی خواہشات کو دل میں جگہ دینے پر مجبور کرتا ہے جو اس کے فطری جذبۂ محبت کے تقاضوں کے خلاف ہوتی ہیں

ایک غلط نصب العین کی محبّت انسان کی بعد از مرگ زندگی کو دشوار بناتی ہے

(۷) اس آدمی کے افعال جو ایک غلط نصب العین سے محبت کر رہا ہو نہ صرف یہ کہ آخر کار اس دنیا میں اس کے کسی کام نہیں آتے بلکہ وہ اس کی اگلی دنیا کی زندگی میں بھی اس کی ترقی اور خوشی کے راستہ میں ناقابلِ عبور، دلدوز اور درد انگیز رکاوٹوں کا سامان بن جاتے ہیں۔

نوعِ انسانی کے بقا کی ایک لازمی شرط

اگر ہم فقط انسان کی اس دنیا کی زندگی کو ہی زیرِ غور لائیں تو پھر بھی غلط نصب العینوں سے محبت کرنے کے نقصانات اتنے شدید ہیں کہ اس میں ذرا شک نہیں رہتا کہ اگر قدرت انبیاء کو بھیج کر انسان کی اس کوشش کی صحیح راہ نمائی کا اہتمام نہ کرتی جن کے ذریعہ سے وہ نصب العین کی محبت کے فطری جذبہ کی تشفی کرتا ہے تو اس بات کی کوئی امید نہ ہو سکتی کہ نوعِ انسانی تا دیر کرۂ ارض پر زندہ رہ سکے گی۔ لیکن اب جبکہ خدا کی رحمت سے نبوّت کی ہدایت دنیا میں موجود ہو چکی ہے صورتِ حال مختلف ہے۔ جس قدر زیادہ نوعِ انسانی اپنے مختلف گروہوں کے باہمی دشمنیوں اور رقابتوں کی وجہ سے اپنی ہلاکت اور بربادی سے قریب آتی جائے گی (اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت وہ دن بدن اس سے زیادہ قریب آتی جا رہی ہے) اسی قدر زیادہ وہ اس بات پر مجبور ہو گی کہ اس خطرناک صورتِ حال کا کوئی مؤثر اور کامیاب علاج تلاش کرے اور اس کا مؤثر اور کامیاب علاج اسے صرف تعلیم نبوّت میں ہی مل سکے گا جو انسان کی خوش قسمتی سے پہلے ہی موجود ہے۔

وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۝ (العصر)

قسم ہے زمانہ کی۔ انسان یقیناً بڑے نقصان میں ہے سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو اتباعِ حق کی تلقین کرتے ہیں اور صبر سے کام کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

اور ہم نے فقط آپ کو اہلِ عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

صحیح نصب العین سے محبت کرنے کی برکتیں

جب کوئی انسانی فرد یا انسانوں کا گروہ انبیا کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے اور خدا کے

سچّے نصب العین سے محبت کرنے لگ جاتا ہے تو اس حالت کو اسلام کی اصطلاح میں حالتِ ایمان کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسا فردِ انسانی یا ایسا انسانی گروہ صاف اور سیدھی سڑک پر چل نکلتا ہے جو اس کے انتہائی ہمہ گیر کمال کی طرف جاتی ہے اور آخر کار وہ اتنا کامل اور بے عیب ہو جاتا ہے جتنا کہ ہم کسی فرد یا گروہ کے کامل اور بے عیب ہونے کا تصوّر کر سکتے ہیں۔

زندگی اور اس کی اقدار کا صحیح نقطۂ نظر

وہ انسان جو خدا کے صحیح نصب العین سے سچی محبت کرتا ہے زندگی اور اس کی قدروں کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیدا کر لیتا ہے۔ اشیا اور اشخاص کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ درست ہو جاتا ہے اور اس کے الفاظ اور افکار اور افعال درست ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی چیزوں سے محبّت کرتا ہے جو درحقیقت ستائش اور محبت کے قابل ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں سے نفرت کرتا ہے جو درحقیقت زشت اور قابلِ نفرت ہوتی ہیں۔ صرف ایسا شخص ہی نیکی، سچائی، عدل، مساوات، اخوت، حریت وغیرہ اصطلاحات کے معنی صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور پوری طرح سے ان کی اہمیّت اور ضرورت محسوس کر سکتا ہے۔ وہی اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے نصب العین کو وہ تمام محبت پوری طرح سے دے سکے جس کی استعداد اس کی فطرت میں رکھی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ اپنے نصب العین کے اندر کوئی کمی یا نقص دریافت کر سکے۔ اس کے برعکس اسے یہ معلوم کر کے خوشی ہوتی ہے کہ اس کے نصب العین کا حسن وکمال ہر لحہ اس سے کہیں زیادہ ثابت ہو رہا ہے جو وہ اس کی طرف منسوب کر رہا تھا۔ پھر چونکہ اس کی فطرت کا جذبہ محبّت اس کے صحیح نصب العین کی وجہ سے نہایت آسانی کے ساتھ پوری پوری تشفی حاصل کر رہا ہوتا ہے وہ ایک گہری مسرّت اور گہرے اطمینانِ قلب سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ پھر وہ پریشانیوں اور ذہنی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی شخصیّت نہایت ترقی یافتہ نہایت ہی متحد اور طاقتور اور دلیر اور باوقار ہوتی ہے۔

کامل ترین ریاست کی واحد بنیاد صحیح نصب العین ہے

جب محولہ بالا اوصاف سے متّصف افراد مل جل کر ایک اجتماعیت یا ریاست تشکیل دیتے

ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا ہونا لازمی امر ہے۔ تو ان کا بحیثیت اجتماع رویّہ اور کردار بھی صائب اور درست ہوتا ہے۔ ایسی ہیئتِ اجتماعیہ یا ریاست اس قابل ہوتی ہے کہ وہ اپنی خارجی و عملی زندگی کے تمام مظاہر میں، حسن، خوبی اور صداقت کی اقدار اعلیٰ کو مسلسل جامعیت اور توازن کے ساتھ ابنائے عالم کے سامنے پیش کر سکے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے یہ اقدار اس ریاست کے باسیوں کی سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی، قانونی، تعلیمی، ذرائع ابلاغ عامہ، نظری و فکری زندگی، عسکری طور طریق غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ایسی ریاست میں معاشی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی۔ ایسے معاشرے کے افراد خود بھی حریّت اور مساوات کی نعمتوں سے بدرجہ اتم مستفید ہوتے ہیں اور انہیں دوسرے معاشروں کو پیش کرنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ وہ ان تمام بیرونی عناصر کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتے ہیں جو اُن کی آزادی و حریّت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس ہیئتِ اجتماعیہ یا ریاست میں ایسے کوئی قانون نہیں ہوتے جو اس کے شہریوں کو ان کی مرضی کے خلاف چلنے کو کہیں اور ایسے کوئی سماجی یا تعلیمی اثرات نہیں ہوتے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی فطرت سلیم کے خلاف ہوں جیسے جیسے یہ شہری اپنے اعلیٰ نصب العین کی صحیح پہچان اور محبت اور اس کے لیے جذبۂ خدمت حاصل کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے زیر اثر ان کی باہمی محبت و اُلفت بھی بڑھتی جاتی ہے، ریاست اسی طور پر داخلی استحکام و تنظیم اور قوّت و جذبۂ عمل میں اعلیٰ ترین درجہ حاصل کرتی چلی جاتی ہے۔ نتیجتاً یہ کامل ترین، اور خوشحال و پُرمسرت افراد کی اجتماعیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس طرح یہ ایک ایسی کامل ریاست کا نمونہ پیش کرتی ہے جو ہر قابل تصوّر بُرائی و نقص سے پاک اور ہر خوبی و کمال سے متصّف ہو۔ ان کے نظریۂ حیات کی ماہیت ان کے پیہم پُرمسرت اور رُو بہ ترقّی وجود کی ضمانت ہے۔ گویا اعلیٰ ترین اجتماعی وجود ان کے مبنی بر صداقت فلسفۂ حیات کا نتیجہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ

الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُ کُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ○ (حٰمٓ السَّجْدَۃ:۔ ۳۰، ۳۱)

یقیناً جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے خوشی مناؤ۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (تمہارے رفیق ہیں) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گی اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لیے موجود ہو گی۔

یہ نظریۂ حیات اس بات کی کامل ضمانت دیتا ہے کہ یہ افراد دشمنوں کے عزائم کے علی الرغم نہ صرف اپنا وجود مسلسل برقرار رکھیں گے بلکہ دنیا میں ہر اعتبار سے ترقّی کریں گے اور پھلے پھولیں گے۔ بمطابق آیت قرآنیہ۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ○ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّھَا ط (اِبْرَاھِیْم: ۲۴، ۲۵)

اللہ (تعالیٰ) نے پاکیزہ بات کی مثال بیان فرمائی ہے جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں۔ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دے رہا ہو۔

یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج (ابراھیم: ۲۷)

ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا و آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا ط (البقرۃ: ۲۵۶)

پس جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

صحیح نصب العین پر تشکیل شدہ ریاست ہی مخالفانہ نظریاتی جنگ و جدال سے نبرد آزما ہو سکتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا اسلامی ریاست اگر صحیح خطوط پر واقعتاً متشکل ہے تو اسے رفتہ رفتہ چار دانگ عالم میں پھیل جانا چاہیئے اور پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہیئے۔ نظریۂ حیات کی باہمی مناقشت میں اسلامی نظریۂ حیات کی آخری اور مکمل کامیابی مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ہے۔

ا۔ اس ریاست کی شہریت محدود نہیں ہے یعنی یہ کسی خاص خطّے، نسل، زبان یا رنگ سے مختص نہیں ہے، بلکہ اس کی شہریت دنیا کے ان تمام لوگوں کے لیے کھلی ہے جو صحیح نصب العین سے محبّت کرتے ہیں اور اس کے لیے جذبہ کار رکھتے ہیں۔

ب۔ چونکہ اس ہیئتِ اجتماعیہ کا نصب العین ہر قسم کی نظری و عملی خرابیوں سے پاک ہے اس لیے اسی کو دنیا میں برتر اور فاتح حیثیّت حاصل ہو سکتی ہے۔ غلط اور مبنی بر کذب نظریاتِ حیات اپنی داخلی کمزوریوں اور تضادات کی وجہ سے کہیں بھی قائم نہیں رہ سکتے اور بالآخر ناکامی ان کا مقدر بنتی ہے۔

ج۔ اس ریاست کے جملہ شہریوں کے عمومی اخلاق اتنے بلند اور ان کی شخصیات اتنی مربوط ہوتی ہیں کہ یہی صفات ان کی افواج کے سپاہیوں میں بھی پائی جاتی ہیں اور ان کی ہمّت و عظمت ہمیشہ بلند رہتی ہے۔

د۔ اس کا نصب العین انسانیت کے ہر دم ارتقا پذیر فلسفیانہ اور سائنسی علم سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے نظریۂ حیات کو زیادہ یقین آور، منظم اور سائنسی انداز پر استوار کرتا ہے چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ریاست ہتھیاروں اور آلاتِ حرب کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے بنیادی تصورات کی قوّت کی بنا پر عالمی فتح حاصل کرے گی۔ اس کی فتح انسانیت کے لیے انتہائی مسرت اور اطمینان کا باعث ہوگی کیونکہ یہ اقوام عالم کے درمیان پیکار اور جنگ و جدل کا مکمل طور پر خاتمہ کر کے انہیں ایک مضبوط وحدت میں باندھ دے گی۔ اسلامی ریاست

کی کامیابی اللہ کی زمین پر نہ صرف دیرپا امن و آشتی کا باعث ہوگی بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسانی ارتقاء کے اعلیٰ ترین اہداف کا حصول بھی ممکن بناتے گی۔

صحیح نصب العین کیونکر انفرادی اور اجتماعی کمال پر منتج ہوتا ہے

یہاں سوال کیا جاسکتا ہے کہ صحیح نصب العین کا تعین کیسے فرد اور اجتماع کو یکسر بدل دیتا ہے اور انہیں کمال اور اعلیٰ ترین سطح پر لے آتا ہے؟

دراصل حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی بھی صحیح نصب العین کو اپنے فکر و عمل میں اختیار کرتا ہے تو وہ خود بخود یا بالفاظ دیگر اپنے نصب العین کی قوت سے اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اس طور عمل کرے جو اس کی داخلی بالیدگی کی ضمانت دے۔ اور یہی چیز خارج میں اپنے خالق حقیقی کے ساتھ محبّت و تعلق کے اظہار کا سبب بن کر اس تعؔ کی صفات حسنہ یعنی حسن و کمال کی جامع ترین معروضی صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور یوں صحیح نصب العین انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکمل ترین وجود کا باعث بنتا ہے۔

ایمان، محبّت، خود آگاہی، خود شعوری یا معرفتِ خالق

جس لمحے ہی ایک شخص انبیاء کرام کی دعوتِ حق پر لبیک کہتا ہے اور اعلیٰ رُؤوس الاشہاد اعلان کرتا ہے کہ صحیح نصب العین ہی اس کی فطرت کا اعلیٰ ترین نصب العین اور ہدف ہے وہ اپنے خالق حقیقی کے مکمل حسن و خوبی کا ادراک حاصل کر لیتا ہے اور دوسرے تمام باطل نصب العینوں میں حسن و خوبی کی غیر موجودگی بھی اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ حسن ازلی کی چمک پہلی بار اس کے حیطہ بصیرت میں آتی ہے اور خالق حقیقی سے محبت کا جذبہ پہلی بار اس کے سینے میں موجزن ہوتا ہے۔ معرفت خداوندی بھی پہلی بار صحیح طور پر اس پر آشکارا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کے وجود و صفات کی نوعیت کیا ہے اور اس تعؔ کا تعلق اس کی زندگی سے کیا ہے!! اور صحیح خود شناسی بھی اسے پہلی بار نصیب ہوتی ہے۔ اس کا مطلوب حقیقی کیا ہے اور اس کی زندگی کا اصل مطمع نظر اور مقصد کیا ہے!! چنانچہ اس کا اعتقاد اس کے جذبہ محبت اور معرفت

خودی و خدا کے مترادف ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا ایمان، خود شناسی اور خالق حقیقی کی معرفت اور اس تعالیٰ کے عشق کے ہم معنیٰ ہے۔ ازاں بعد یہ صادق جذبۂ محبّت اگر صحیح خطوط پر پروان چڑھتا رہے اور اس کی مسلسل نگہداشت کی جاتی تو یہ پیہم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنی خودی کے اعلیٰ ترین ارتقار کا باعث بنتا ہے۔ اس نقطۂ عروج پر انسانی خودی انبساط، اطمینان، خود اعتمادی اور خود انضباطی کی وہ اعلیٰ ترین سطح حاصل کر لیتی ہے جس کی یہ اہل ہے۔ اس کا جذبہ محبت جوں جوں بڑھتا اور خالص تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا اعتقاد بھی اتنا ہی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کی معرفتِ خداوندی اور علم ذات بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی کیفیتِ انبساط، خود انضباطی اور خود اعتمادی میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جذبہ محبّت (عشق) کو اگر پورے طور پر اور مسلسل اظہار کا موقع نہ دیا جائے تو اس کے ثمرات حاصل نہیں ہوتے اور اگر کوئی منہ زور نفسانی خواہش ابھر کر اس کا رُخ غیر فطری سمت میں موڑ دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جذبہ کی صحیح طور پر نگہداشت نہیں کی جا رہی۔ ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے کہ جذبہ محبّت (عشق) کے مکمل اور آزادانہ اظہار کے لوازم کیا کیا ہیں اور یہ کہ نفسانی خواہش کی اصل ماہیّت کیا ہے اور یہ کس طرح عاشق کی روحانی زندگی میں نقصان کا باعث بنتی ہے۔

نصب العین کیلئے محنت۔ (عبادت)

صحیح نصب العین کی محبّت جس عمل اور کوشش پر ابھارتی ہے وہ داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ داخلی یا ذہنی عمل آیات و تماثیل کے ذریعے خالق حقیقی کی صفات پر تدبّر و تفکّر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ تدبر و تفکر ہمیشہ ان صفات قدسیہ کی حمد و تعریف پر منتج ہوتا ہے اور جس قدر کوئی فرد جذبہ محبّت اور خود شناسی کی دولت سے مالا مال ہے، اتنی ہی یہ حمد و تعریف گہری ہوتی ہے۔ صفاتِ خداوندی کی وہ آیات و تماثیل جو ان صفات پر غور و تفکر کا ذریعہ بنتی ہیں دو قسم کی ہیں۔

ا۔ وہ مظاہرِ قدرت جن میں خالق اپنی صفات کا اظہار کرتا ہے۔
ب۔ وہ الفاظ جو حق تعالیٰ کی صفات کو بیان کرتے ہیں۔

صفاتِ حُسن کا مطالعہ

ا۔ **مظاہرِ قدرت کے ذریعے۔ (فکر)** چونکہ عالمِ فطرت ذاتِ خداوندی کی تخلیق ہے، اس لیے اس میں الوہی صفات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ آسمانوں، سُورج، چاند، ستارے، پہاڑ، زمین، وسیع و عریض سمندر، طلوع و غروبِ آفتاب کا منظر، بادل، دریا، ندیاں، ہوائیں، دن اور رات کا اُلٹ پھیر، موسموں کا تغیّر و تبدل، حیوانی اور نباتاتی زندگی کی بوقلمونی و کثرت ـــ غرضیکہ مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی سطح پر قدرت کے مختلف النوع شاہکار اپنی تمام تر تخلیق، افزائش، رنگ و نسل کی تفریق، عادات و خصائل اور حرکات و افعال کے اعتبار سے اپنے خالق کی صفات کا اسی قدر مظہر ہیں جس طرح آرٹ کا ایک شاہ پارہ اپنے خالق آرٹسٹ کے اخلاقی اور ذہنی سانچے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان مظاہر کا بنظرِ عمیق مطالعہ ایک صاحبِ ایمان شخص کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خالق کی صفات پر زیادہ بہتر طور پر تدبّر و تفکّر اور ان کی تعریف و تحمید کر سکے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿ (الذّٰریٰت: ۲۰)

اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ۙ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (اٰل عِمران: ۱۹۰، ۱۹۱)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں (اُن) ہوشمند لوگوں کے لیے (بہت) نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے

اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے (اس سے کہ عبث کام کرے) پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

مطالعہ فطرت جسے اسلامی اصطلاحات میں 'فکر' کا نام دیا جاتا ہے، نہ صرف صحیح نصب العین کے لیے محبت کے اظہار اور اس کی نشو و نما کا ذریعہ ہے، بلکہ تمام انسانوں میں اس محبت کا بیج بونے کا محرک بھی ہے۔ چونکہ ہم سب اپنی حیات دنیوی کے پورے عرصے میں اس فطرت کے درمیان رہتے ہیں اس لیے ہم میں ہر شخص مظاہر فطرت پر غور و تدبر اور اس کے حسن و جمال کی تعریف پر مجبور ہے۔ نتیجتاً ہم میں سے ہر فرد ایک خالق کی صنّاعی، عظمت، خوبی، حسن و جمال اور طاقت و قدرت کا احساس حاصل کرنے پر مجبور ہے چاہے ہم میں سے چند افراد میں یہ احساس قدرے دُھندلا ہی کیوں نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارا عقیدہ اور مذہب خواہ کچھ ہی ہو، ہم اکثر فطرت کے بارے میں گفتگو ایک شخصی وجود کی حیثیت سے کرتے ہیں جس کا اپنا ایک کردار ہے اور جو اپنی جملہ کارگزاریوں کا شعور رکھتا ہے۔ اور ان افعال و وظائف کا کوئی مقصد و ہدف ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم میں اکثر اس احساسِ حُسن کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ احساس باقی تمام اقسام احساس کی طرح مناسب تفہیم اور اظہار کا متقاضی ہے۔ اور یہ لوگ اسی کا اہتمام نہیں کر پاتے۔

وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ (یوسف: ۱۰۵)

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔

اس کا عملاً نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذہن کی شعوری سطح پر ہم سے اکثر لوگوں میں یہ احساس کچل دیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی وجہ جواز ہماری فطرت کا حصّہ ہے اور یہ ہماری ہستی کے طاقتور

ترین جذبے سے نہ صرف مطابقت رکھتا ہے بلکہ اس کے اظہار کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ یہ جذبہ کبھی بھی پورے طور سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ہوتا یہ ہے کہ اسے وقتی طور پر صرف دبا کر غیر شعوری سطح پر دھکیل دیا جاتا ہے جہاں یہ ایک چنگاری کی صورت ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ اس طرح حقیقی ملحد کا وجود ممکن نہیں۔ ایک ایسا شخص جسے عام طور پر ملحد کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، الفاظ اور عمل میں کھلے بندوں خدا کا انکار کرتا ہے لیکن چونکہ اس کا بھی فطرت سے ناگزیر تعلق ہے اس لیے اپنے نہاں خانہ دل میں وہ بھی اس کے حسن وجمال کا ایک گہرا مگر غیر شعوری احساس رکھتا ہے اور اس طرح حقیقتاً خدا کے وجود کا اعتراف کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ نامساعد حالات اور تکالیف میں گھر جاتا ہے تو دعا اور مناجات ہی کا سہارا لیتا ہے۔

وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝

(لقمٰن: ۳۲)

اور جب ان پر (دریا کی) لہریں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسے پکارنے لگتے ہیں۔ پھر جب وہ انہیں نجات دیکر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو بعض ہی انصاف پر قائم رہتے ہیں۔ اور ہماری نشانیوں سے وہی انکار کرتے ہیں جو عہد شکن (اور) ناشکرے ہیں۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ۙ

(العنکبوت: ۶۵)

پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

جب ایک رسول دنیا میں آتا ہے تو وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو انسانیت کیلئے نئی یا اجنبی ہو، بلکہ اس احساس حُسن کو جگاتا اور زندہ کرتا ہے جو ان کے دلوں میں پہلے ہی دبا ہوا موجود ہوتا ہے۔ وہ اس سے پہلے ہی واقف ہوتے ہیں۔ رسول وانبیاء اس جذبے اور احساس کو مزید نکھارتے اور اس کے حقیقی مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ اور اس کے اظہار کا صحیح طریقہ سکھاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز لوگوں کو مطالعہ فطرت کی دعوت سے کرتے ہیں۔ وہ فطرت چہار اطراف سے ان کے مشاہدے میں آتی ہے اور ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کیا یہ مظاہر فطرت اپنے اندر ایک خالق کی صفات محبّت، حُسن، حکمت اور قدرت کے واضح دلائل نہیں رکھتے ؟ اور کیا یہ انسان کو محبت، تشکر اور حمد و ثنا کے جذبات میں ایک خدائے مُطلق کے سامنے جھکنے پر مجبور نہیں کرتے ؟ حقیقت یہ ہے کہ صرف ان اوصاف حمیدہ سے متصف خدائے لایزل ہی انسانیت کا سچا نصب العین ہو سکتا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ج فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

(العنکبوت: ۶۱)

اور اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کدھر سے اُلٹے جا رہے ہیں ؟

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ط بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ (العنکبوت: ۶۳)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو الحمدللہ، مگر اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○

(یونس: ۳۱-۳۲)

اِن سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو، پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟

قرآن حکیم بار بار اور مختلف اسلوب میں بنی نوع انسان کو مظاہر فطرت کے مشاہدہ و مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور ان کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کراتا ہے کہ یہ مظاہر فطرت اپنے خالق کی صفات حسن و کمال کی کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○ (البقرة: ۱۶۴)

یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے

دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

(الرّوم: ۲۰، ۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبّت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ج فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ○ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ج وَهُوَ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (الرّوم : ۴۸ تا ۵۰)

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تُو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خُرّم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مُردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے، یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝ (الرّوم : ۲۲ تا ۲۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سُنتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف

کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جونہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔

اَفَلَا يَنظُرُونَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝ (الغاشیہ: ۱۷ تا ۲۰)

یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح نصب کیے گئے ہیں۔ اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔

خالق کائنات کے حسن و خلّاقیت کا احساس اجاگر کرنے میں مطالعہ فطرت ایک اہم ذریعہ ہے اور اس کا دائرہ کل تلاشِ علم پر محیط ہے۔ علم کا ہر شعبہ اور اس کی صحت مند جستجو اس میں ممدّ ہے۔ گویا اس طرح اسلامی اصطلاح میں 'فکر' یا مطالعہ مظاہر فطرت تمام علوم طبعیہ کی بنیاد میں موجود ہے۔ جب مطالعہ فطرت کا عمل باضابطہ ہوتا ہے تو یہی سائنٹفک ریسرچ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس ریسرچ میں پیہم انہماک ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم وہ قوانین فطرت معلوم کر سکیں جو تخلیق کی تمام سطحوں پر کارفرما ہیں۔ مزید برآں ہم انہیں زیادہ سے زیادہ زندگی کی آسانیوں اور سہولتوں کے حصول کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

ب۔ صفاتِ حُسن کا مطالعہ الفاظ کے ذریعے۔ (ذکر)

اشارات کی دوسری قسم جس کے ذریعے ایک عاشق صفات الٰہیہ کے حسن و جمال پر تدبر کر سکتا ہے وہ الفاظ ہیں جو ان کو انسانی ذہن پر آشکار کرتے ہیں۔ ان الفاظ کی ایک لسٹ (جنہیں الاسماء الحسنیٰ یا صفات حسنہ بھی کہا جاتا ہے) جو حُسن ازل کے خوبصورت صفات

کو ظاہر کرتی ہے۔ سطور بالا میں دی جا چکی ہے۔ خالق حقیقی کی محبت سے سرشار ہو کر ایک صاحب ایمان ان میں سے چند صفات کے معانی پر ارتکاز توجہ کرتا ہے تاکہ وہ ان کی اہمیت کو کسی درجے میں جان کر ان کی زیادہ سے زیادہ تحمید و ستائش کر سکے، ان صفات حسن کو زیادہ سے زیادہ اپنا سکے اور انہیں حرز جان بنا سکے۔ اسماء حسنیٰ میں سے چند کا انتخاب اس کے کسی وقت کے مزاج یا طبیعت کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اس باطنی مجاہدہ کے دوران جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ حسن کی دریافت اور حصول ہے، ایک صاحب ایمان ان صفات کا بار بار زبان سے ورد کرتا ہے۔ اور اس عمل میں وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ اس کی توجہ ان الفاظ صفات کے معانی پر مرتکز رہے۔ یہی عمل دینی اصطلاح میں "ذکر" کہلاتا ہے۔

ذوق محبت کے تحت ایک صاحب ایمان ہر لمحہ اس حسن لازل سے تعلق قائم کرنے کی سعی کرتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں کوئی موقع بھی نہیں گنواتا چنانچہ حتی المقدور اور موقع و محل کے مطابق وہ مندرجہ بالا ہر دو قسم کے اشارات کو تفہیم حسن میں استعمال کرتا ہے۔ مظاہر قدرت اور وہ الفاظ جو خالق کی صفات حسنہ کو بیان کرتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج

(آل عمران: ۱۹۱)

جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔

حسن کی یافت اور معرفت خواہ کسی ذریعے سے ہو، اس کی اصل وہ محبت ہے جو صاحب ایمان کے دل میں ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ذرائع میں سے کسی کا استعمال بجائے خود ذوق محبت کو جلا دیتا ہے۔ اور اس کی افزائش کا باعث ہوتا ہے چنانچہ یہ جزوی طور پر ذوق محبت کے آغاز اور اس کے نشو و نما کا نتیجہ یا ثمر بھی ہے اور اس کی علت بھی۔ ایک شخص کی اپنے خالق کے لیے محبت جتنی زیادہ ہوتی ہے، وہ اسی قدر اس کی صفات کا مشاہدہ مظاہر فطرت میں کرتا ہے۔ اور اسی تناسب سے اس کے حسن کی تعریف

وتحمید بڑھتی چلی جاتی ہے۔اس کے برعکس ایک شخص جتنے تسلسل اور دلجمعی کے ساتھ صفات خالق کا مطالعہ کرتا ہے، اسی قدر ان صفات کی تعریف وتحمید اس کی نظر میں بڑھتی چلی جاتی ہے اور نتیجۃً اس کا ذوقِ محبت بھی زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔اس طرح ایک صاحبِ ایمان کی حسن کی محبت اور حسن کی یافت ومعرفت اس کی خود شعوری کے ارتقائی عمل میں ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتے ہیں۔

نماز زبانی تکرار نہیں، بلکہ ذہنی عمل کا نام ہے

ذکر ایک ذہنی عمل ہے نہ کہ صرف الفاظ کا تکرار اعادہ۔ذکر کی اصل رُوح تفکّر وتدبّر کی وہ داخلی کیفیّت ہے جو حسن ازلی کے ساتھ تعلّق کی استواری سے پیدا ہوتی ہے۔اور یہ کیفیّت بلا استثنا، تسبیح وتحمید، عجز وانکساری، خوف ورجا اور مسرّت واطمینان کے جذباتِ عالیہ کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔اور یہ جذبات یکے بعد دیگرے محُبّ کے ذہن میں محبوبِ حقیقی کے ساتھ اس کے وقتی رجحان اور تعلّق کی مناسبت سے آتے جاتے ہیں۔الفاظ کا زبان سے بار بار ادا کرنا صرف اس لیے ہے تاکہ یہ عاشق کی اس کیفیّت کے حصُول میں مدد دے اور یہ مدد اس طرح ہوتی ہے کہ یہ الفاظ حسن ازلی کی ان صفات پر ارتکازِ توجّہ کا باعث بنتے ہیں جن کا اظہار ان سے ہوتا ہے۔اگر نماز یا عبادت کا بدنی عمل اس داخلی ذہنی سعی کے ساتھ نہ ہو تو وہ جذباتِ محبّت وعبودیت میں بالیدگی کا باعث نہیں ہوسکتا۔اگر نماز یا ذکر کا عمل مندرجہ بالا جذبات کے ساتھ ہے تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ داخلی کوشش موجود ہے اور محبّ کا علم وعرفان ترقی پذیر ہے۔قرآن مجید مندرجہ ذیل آیات میں اسی حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ○ (الانبیاء: ۹۰)

ترجمہ: "اور وہ امید وبیم کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے آگے (عجز ونیاز سے) جھکے رہتے تھے۔"

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ○ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ○
(المومنون: ۱-۲)

ترجمہ: "یقیناً (وہ) ایمان لانے والے فلاح پاگئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں"۔

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ (الاعراف: ۵۵)

ترجمہ: "اپنے ربّ کو پکارو، گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے"۔

وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ

(الاعراف: ۵۶)

ترجمہ: "اور اُسی کو پکارو (اُس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کی رحمت سے) اُمید رکھتے ہوئے۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکو کاروں سے قریب ہے"۔

خدا سے واقعی محبّت رکھنے والا فرد ہمیشہ خوف اور رجا کے بین بین رہتا ہے اس کو خوف اس بات کا رہتا ہے کہ مبادا وہ جذبۂ محبت سے تہی دامن ہو کر اپنے محبوب کی ناراضگی مول نہ لے لے۔ اور امید و رجا اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کی محبّت و سپردگی اسے اپنے محبوب کی نظروں سے پہلے سے زیادہ بلند کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْاِيمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔

ترجمہ: ایمان خوف اور اُمید کے درمیان پایا جاتا ہے۔

عبادت گزار کا سب سے بڑا انعام اس کے جذبۂ محبّت اور نتیجتاً اس کی شخصیّت کا کامل ارتقاء ہے

جب محبّتِ خداوندی خلوص اور نکھار کا اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل کر لیتی ہے تو اس وقت محبّ محبوب کی ناراضگی سے فی نفسہٖ خائف رہتا ہے۔ اس کا یہ خوف اس سزا یا عقوبت کے ڈر سے نہیں ہوتا جو اس طور واقع ہو سکتی ہے۔ اس کے نزدیک محبوب کی ناراضگی سے بڑی سزا ناقابلِ تصوّر ہے۔ اسی طرح وہ محبوب کی پسند اور رضا کا فی نفسہٖ طلبگار ہوتا ہے نہ اس لیے کہ یہ کسی دوسرے انعام کا باعث بنتا ہے۔ اس کے نزدیک محبوبِ حقیقی کی پسند اور رضا سے زیادہ بڑا کوئی

انعام نہیں ہے۔ ازروئے قرآن اللہ تعالیٰ کی رضا وہ سب سے بڑا انعام ہوگا جو کسی صاحبِ ایمان کو جنّت میں داخل ہوتے ہوئے حاصل ہوگا۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ: ۷۲)

ترجمہ: "اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی یہی بڑی کامیابی ہے۔"

یہ انعام اتنا خوش کن اور لذّت آگیں ہوگا کہ اس کی کیفیّت یا کمیت کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی اس دنیا میں نہیں لگایا جاسکتا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (السجدة: ۱۷)

ترجمہ: تو کسی متنفّس کو علم نہیں کہ کیسا کیسا آنکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) ان کے لیے (خزانۂ غیب میں) مخفی ہے۔ یہ ہے صلہ ان کے (نیک) اعمال کا۔

اس متوقع انعام کی نوید جانفزا اُسے جنّت الفردوس کے دروازے پر ہی سنا دی جائیگی۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ڰ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (الفجر: ۲۷۔۳۰)

"اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنّت میں۔"

عبادت کے زندہ عمل کے ساتھ عبدیّت، عجز و انکساری اور نفی ذات کے جذبات اس لیے ہوتے ہیں کہ انسانی خودی اپنے خالق اور معبود کے قریب سے قریب تر ہونا چاہتی ہے اور یہی صورتِ حال حسن لازوال پر تدبّر و تفکّر میں ہوتی ہے۔ یہ جذبات و احساسات محبّ کے شعورِ ذات اور اثبات خودی کے ساتھ متصادم نہیں ہوتے۔ بلکہ درحقیقت یہ انہیں مزید تقویت پہنچاتے ہیں کیونکہ ذاتِ حقیقی کے ساتھ قرب و اتّصال اس میں ایک بے مثال قوّت اور برتری کا احساس اجاگر کرتا ہے۔ محبوب کے حسن اور قدرت کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو جتنا ہیچ اور کم تر خیال کرتا ہے اور جیسے جیسے وہ محبوب حقیقی کی صفاتِ حسن و قدرت کا عرفان زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا ہے، وہ خود اپنی عظمت سے آگہی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔

چنانچہ اس طور محبوب کی صفاتِ حسنہ سے وہ خود حصّہ پاتا ہے اور اپنی شخصیّت میں ان کا انجذاب کرتا ہے۔

باجماعت نمازِ پنجگانہ (صلوٰۃ)

صاحبِ ایمان لوگوں کا باقاعدہ نظم کے تحت اور اپنے میں سب سے افضل شخص کو امام بنا کر اس کی اقتدا میں پانچ وقت نماز ادا کرنا اقامتِ صلوٰۃ کہلاتا ہے۔ اور یہ ذکر کی سب سے اچھی شکل ہے۔ نماز میں ذکر کی وہ ممکنہ اور کم سے کم مقدار آجاتی ہے جس کی ایک صاحبِ ایمان کے ذوقِ محبّت کے اظہار اور اس کی بالیدگی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف ذکر کی عادت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، بلکہ اس سے اس کے ذوقِ محبت کو بھی وقفوں کے ساتھ تقویت پہنچتی ہے جو اس کے مستقبل میں افزونی کا باعث بنتی ہے۔ نماز کا مقام صاحبِ ایمان لوگوں کی جمعیت میں انتہائی اہمیّت کا ہے۔ یہ ان کی پُوری عملی زندگی کے لیے محور کا کام کرتی ہے اور ذکر سے معمور زندگی کا عملی نقشہ پیش کرتی ہے۔ تاہم صرف فرض نماز ایک مومن کے ذوقِ محبّت کی بالیدگی اور اس کی بلند ترین سطح حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے اور اس سے اس سطح پر مطلوب ذکر کی مقدار پوری نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ روحِ انسانی کا مطمعِ نظر ترقی کی یہی چوٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچّے مومن کو فرض نمازوں کے علاوہ بھی اپنی روحانی ترقی اور ترفع کے لیے ذکر کے اہتمام کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

"پھر جب نماز ہو چکے تو (تم کو اختیار ہے کہ) زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ط (البقرۃ: ۲۰۰)

"پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پُورے کر چکو تو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کے

ذکر میں لگ جاتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ۔

(آل عمران: ۱۹۰)

"جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔"

حسنِ ازل کے ساتھ رشتۂ محبّت ایک عجیب لذّت، انبساط اور اطمینان کا باعث بنتا ہے اور جوں جوں ذوقِ محبّت ذکر و فکر کے ساتھ بڑھتا ہے یہ انبساط و اطمینان بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ نہ صرف یہ کہ کسی صاحبِ ایمان کے یقین میں اضافے کا باعث بنتا ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک گہرے ذاتی تجربے کی ہوتی ہے۔ یہ ذاتی تجربہ اس کو اپنے ہدف کا علم اور اس کی درستگی کا پتہ بھی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صاحبِ ایمان کے لیے امید اور اعتماد کی ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور مقصدِ اعلیٰ کے حصول میں کوشش کو ابھارتا اور منضبط کرتا ہے بلحوائے آیت قرآنیہ:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ ط اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرّعد: ۲۸)

"ایسے ہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے دِل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ یاد رکھو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔"

ذکر سے جو غیر معمولی اور مخصوص اطمینان ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے وہ بجائے خود اس امر کا ثبوت ہے کہ ذکر فطرتِ انسانی کی اہم ترین ضرورت اور داعیے کو پورا کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فطرت کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر فطری خواہش خواہ اس کا تعلق حیاتیاتی سطح سے ہو یا نفسیاتی سطح سے، جب پوری ہوتی ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر آسودگی اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی خوشی اور آسودگی سے اس خواہش یا داعیے کی تکمیل کی جہت کا تعین ہوتا ہے۔

اخلاقی کردار۔ خارجی عمل میں حُسن کا اظہار

صحیح نصب العین جس خارجی عمل کو اُبھارتا ہے، وہ صفاتِ حُسن کا اپنے تئیں اور دوسروں

کے ساتھ برتاؤ میں اظہار پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام طور پر اسے اخلاقی عمل کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر نصب العین کی طرح صحیح مذہبی نصب العین کا بھی ایک اپنا اخلاقی قانون ہوتا ہے جو فرد کے ہر عمل کی نوعیت اور قدر وقیمت کا تعین کرتا ہے۔ چونکہ یہ قانون صفاتِ حسن سے اپنا جواز فراہم کرتے ہیں، چنانچہ جو فرد بھی ان قوانین کی پابندی کرتا ہے اس کا عمل بھی صفاتِ عالیہ کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ جو شخص کسی نصب العین کو اپناتا ہے اور اس سے محبّت کرتا ہے، وہ اپنی محبّت کا اظہار ہر ممکن عمل میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی صحیح دینی نصب العین سے محبّت کرتا ہے وہ اس کا اظہار نہ صرف حسن لازوال پر ارتکاز توجہ سے کرتا ہے بلکہ اپنا پورا عمل بھی اسی کے مطابق کر لیتا ہے۔ اس کے شب و روز اور اس کا پورا کردار و عمل اس کے عین مطابق ہو جاتے ہیں:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَاشَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (الانعام: ۱۶۳، ۱۶۴)

"کہو، میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ربّ العٰلمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔"

محبّتِ حسن اور اخلاقی عمل کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا

اگر ایک مدعیٔ ایمان اپنے عمل میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا اظہار نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے خالقِ حقیقی کی صفات اور حسن کا کوئی ادراک حاصل نہیں کیا اور نہ ہی اُسے اس سے محبّت ہے۔ کیونکہ یہ ناقابل تصوّر ہے کہ ایک شخص اللہ کی صفاتِ حسنہ مثلاً حسن، انصاف، حق، خیر، محبّت وغیرہ سے متاثر ہو لیکن اپنے عمل میں ان کا اظہار قطعاً نہ کرے۔ یعنی وہ انصاف کی بجائے ظلم، محبّت کی بجائے نفرت و تشدّد اور حق کی بجائے باطل کا اظہار کرے۔ اگر وہ اپنے دعویٔ محبّت میں سچّا اور مخلص ہے تو تمام اندرونی اور بیرونی مشکلات

اور موانع کے علی الرغم اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کے سانچے میں اپنے عمل کو ڈھالنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ اور اس سعی و جہد میں وہ صفاتِ حسنہ کے شعور کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا، اپنے ذوقِ محبت کو بڑھاتا اور خود آگہی کی بلند تر منزل حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ذوقِ محبت کا جب تک عمل سے تعلق رہتا ہے اس کی شدت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور جونہی وہ عمل سے جدا ہو کر شعوری سطح سے نیچے گرتا ہے، اس کی شدت میں کمزوری واقع ہو جاتی ہے۔

جو شخص ایک بار نیک اور راست عمل کرتا ہے، اس کا دوبارہ کرنا اس کے لیے نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس میں ظلم و تعدی عادتاً موجود ہو جب ایک بار شعوری طور پر مشفق و کریم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تو یہی عمل بار بار کرنے پر اس کے لیے آسان سے آسان تر ہو جاتا ہے، اس کی وجہ اس کے ذوقِ محبت کی صحیح رُخ میں نشوونما ہے۔ ایک غلط عمل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایک بار صراطِ مستقیم سے انحراف کر کے جب ایک شخص غلط کام کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے لیے صراطِ مستقیم پر مراجعت مشکل تر ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے ذوقِ محبت میں کمی اور اضمحلال واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری خود آگہی اور ذوقِ محبت کا ارتقاء کاملۃً ہمارے اعمال کی اخلاقی نوعیت پر منحصر ہے۔ ایک ایسا فرد جو حسنِ ازل کی پہچان کے بعد اس سے تعلق کا اظہار صرف ذکر و فکر کی شکل میں کرتا ہے لیکن اپنے روزمرہ کے افعال و اعمال میں اس کا اظہار نہیں کرتا، خود آگہی اور عرفانِ ذات کے اعلیٰ مدارج حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ احتمال اس بات کا بھی ہے کہ اس کا ذوقِ محبت کم ہو جائے کیونکہ صرف گیان دھیان سے وہ اسے جتنا مستحکم کرتا ہے، اپنی بے عملی کے نتیجے میں وہ اُسے اس سے زیادہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ طرزِ عمل یقینی طور پر گھاٹے کا سودا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص صبح کے وقت ڈو گھنٹے اپنے ہدف کی طرف صحیح راستے پر چلے، لیکن دن کا باقی حصّہ بالکل مخالف سمت میں چلتا رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کبھی بھی اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس سے دُور ہی ہٹتا چلا جائے گا۔

اخلاقی عمل کیونکر رفتہ رفتہ آسان تر ہو جاتا ہے

جب کوئی محبّ صحیح نصب العین سے محبت کرنا شروع کرتا ہے تو آغاز میں اُس کا جذبۂ محبت کمزور ہوتا ہے چنانچہ اس نصب العین کے اخلاقی قانون کی پیروی میں بھی کوتاہی اور نقص رہ جاتا ہے۔ مکمل اور ہر نقص سے پاک پیروی ارتقاءِ خودی کی بلند سطح پر ہی ممکن ہے۔ جب تک محبّ یا سالک اُس منزل تک نہیں پہنچ جاتا، انتہائی کوشش کے باوجود وہ اکثر غلطیوں اور خامیوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب نماز اور دوسرے اذکار کا باقاعدہ اہتمام کر کے وہ حسنِ لازوال سے اپنا رشتۂ محبت مضبوط کر لیتا ہے اور اپنے نفس کے اندھے داعیات پر کنٹرول حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لیے جملہ اخلاقی قوانین پر کاربند ہونا آسان تر ہو جاتا ہے۔ اس کا عمل خامیوں سے مبّرا اور اخلاقی اعتبار سے اعلیٰ تر ہوتا چلا جاتا ہے اور حسنِ مطلق کی صفات حمیدہ سے اُس کی ہم آہنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سطح پر اخلاقی عمل حسن پر ارتکازِ توجہ مزید ممکن بنا کر فرد کو اعلیٰ تر سطح کی خود شعوری اور ادراکِ ذات بہم پہنچاتا ہے۔ حسنِ مطلق کی زیادہ بہتر معرفت اور معیّت پا کر جب ایک صاحبِ ایمان اپنے مشغولاتِ ذکر و فکر کی طرف لوٹتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اب ان میں پہلے سے کہیں زیادہ ارتکازِ توجہ کر سکتا ہے اور اس طرح وہ ان سے اطمینان و انبساط بھی زیادہ حاصل کرتا ہے۔ حسنِ مطلق کا یہ مراقبہ اُس کے جذبۂ عشق کو مہمیز دیتا ہے اور زندگی کے شب و روز میں اخلاقی قانون کی بجا آوری کو سہل بنا دیتا ہے۔ اس طرح مراقبہ (یعنی ذکر و فکر) اور اخلاقی عمل باہم دگر لازم و ملزوم ہیں اور دونوں مل کر فرد کو ادراکِ ذات کے اعلیٰ تر مقام پر لے جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ ارتقاءِ جذبۂ حُبّ کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ امر واقعہ یہ ہے کہ جذبۂ محبت کی اگر مناسب آبیاری کی جائے اور اس کے تقاضوں کو مسلسل کما حقہ پورا کیا جائے تو اس میں ضرور اضافہ ہوتا ہے اور اس کی شدت و قوت دو چند ہو جاتی ہے، بمصداق آیاتِ قرآنیہ: وَيَزِيدُ اللّٰهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ط

(مریم: ۷۶)

ترجمہ "جو لوگ راہ راست پر ہیں اللہ ان کو (روز بروز) زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط

(العنکبوت : ۶۹)

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھائیں گے۔"

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ٥

(الکہف : ۱۳)

ترجمہ: وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔"

گناہ کی حقیقت

(ا) اسباب گناہ: ایک مسلمان سے لغزش یا غلطی کا صدور صرف اس وقت ہوتا ہے جب وقتی طور پر اس کا ذوقِ حسن صحیح نصب العین سے مخالف سمت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی خیالِ فاسد اسے اپنی جانب متوجہ کر کے جذبۂ محبت کی غلط سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عمل صحیح نصب العین کی بجائے کسی باطل نصب العین کی مقصد براری کرتا ہے۔ چنانچہ ایک غلطی یا سیاہ کاری دوسری غلطیوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ کوئی باطل یا فاسد خیال ایک ضعیف الاعتقاد شخص کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیتا ہے کہ اگر وہ اس کام کو انجام دے لے تو اسے مسرت حاصل ہوگی یا کسی عارضی رنج و الم سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عمل کے تقاضے اس کے حسن مطلق کے ساتھ رشتۂ محبت کے تقاضوں اور مطالبوں کے خلاف اور متضاد ہیں چنانچہ اصل مسئلہ اس کی اپنی خودی اور اس کے استحکام کا ہے۔ اگر اس میں پختگی نہیں ہے تو وہ حقیقی محبوب اور اس کی محبت کو پسِ پشت ڈال کر اس عارضی آرام یا مسرت کو ترجیح دے دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس لمحے کے لیے حقیقی ایمان اور محبتِ الٰہی سے تہی دامن ہو جاتا ہے اور اس سے غلط اعمال کا صدور ہوتا ہے۔

(ب) گناہ کا خودی پر اثر : جب باطل خیال اور اس کے زیرِ اثر باطل عمل وقوع پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی عارضی لذت ختم ہو جاتی ہے تو ایک صحیح الاعتقاد مسلمان اس لغزش اور نسیان کے بعد دوبارہ اپنے محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی یہ محبت کمزور پڑ گئی ہے اور شیطانی افعال و خیالات کے ساتھ اس کا رشتہ مضبوط ہو رہا ہے۔ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ جیسے خیالات ذہن انسانی میں گھر کیے رہیں گے اور جس قسم کے افعال کا ظہور اس کے اعضاء و جوارح سے ہو گا، ان کا ایک گہرا تاثر اس کے قلب و ذہن پر پڑے گا۔ یہ حقیقت نیک افعال کے بارے میں بھی اتنی درست ہے جتنی افعال شنیعہ کے بارے میں۔ چنانچہ امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی فعل خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو، انسانی خودی کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور اس کی تعمیر یا تخریب کا کام کرتا ہے۔

گناہ سے بچنے کا طریقہ

ایک غلط خیال پہلے پہل انسان کی قوتِ متخیلہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور بعد ازاں اس کے قوائے عمل پر گرفت حاصل کرتا ہے۔ جونہی یہ ذہن میں داخل ہوتا ہے اسی لمحے وہ اس محبت پر نقب زنی کرتا ہے جو صحیح نصب العین کے لیے مختص ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ خیال اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ وہ انسان سے عملِ بد کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہونا یہ چاہیے کہ خیالِ فاسد کو ذہن میں آنے کے بعد فوراً ہی دبا دیا جائے۔ کیونکہ دیر تک غلط سوچ کا ذہن پر مستولی ہونے کا نتیجہ عمل بد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، غلط سوچ اور فکر ہی ہمیشہ غلط کام کا پیش خیمہ ہوتا ہے جس کو شیطانی وسوسے کے تحت کچھ وقت کے لیے ذہن میں گل کھیلنے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔ اگر فکرِ بد کو تخیل کی سطح پر فوری طور پر ختم نہ کیا جائے یہ لازماً عملِ بد پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مومن صادق کے خیال میں جونہی کوئی شیطانی وسوسہ آتا ہے وہ فوراً متوجہ ہو کر شعوری طور پر اسے اپنے ذہن و قلب سے نکال باہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایک پل بھر کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتا۔ ان مومنین صادقین کی یہ شان قرآن کریم نے اس طرح بیان کی ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ (الاعراف : ۲۰۱)

ترجمہ: حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں (اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ) کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے (کہ ان کے لیے صحیح طریقِ کار کیا ہے)

غلط خواہشِ نفس سے بچنے کا نقد فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبّت بڑھ جاتی ہے اور وہ اِس دُنیا میں بھی خوف وحزن سے محفوظ رہتا ہے اور آخرت میں جنّتِ نعیم کا حقدار بنتا ہے۔ جب تک انسان کے ذہن وقلب کے کسی گوشے میں باطل نظریے کے ساتھ تعلق کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے، خواہ اس نے ابھی عمل اس باطل نظریے کے مطابق نہ کیا ہو، وہ حقیقی معنوں میں مومن صادق اور محبِّ صادق نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث نبویؐ میں آیا ہے، اس میں ایمان "رائی کے دانے کے برابر" بھی نہیں رہتا۔

گناہ انسان کی فطرتِ سلیم کے خلاف عمل ہے جو انسانی خودی کے ارتقاء اور ترفّع کے عمل میں منفی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ انسان کے باطن کی قلبِ ماہیت کر کے اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کو ہٹائے بغیر کوئی مسلمان روحانی ترفّع حاصل نہیں کر سکتا۔

گناہ کے بُرے عواقب سے بچنے کا طریقہ: تطہیرِ نفس

گناہ کے بُرے عواقب اور اثرات سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان معصیت کے ارتکاب کے فوراً بعد خود احتسابی کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کون سی ذہنی کیفیت اور حالت تھی جس کی وجہ سے معصیت کا ارتکاب ہوا۔ اسے اس بات کی ازحد پشیمانی ہونی چاہیے کہ وہ جن نفسانی خواہشات کا غلام بن گیا تھا وہ انتہائی گھناؤنی اور قابلِ مذمّت تھیں۔ جتنی گہری یہ پشیمانی ہو گی اتنا ہی اس بات کا امکان کم ہو گا کہ وہ دوبارہ اس گناہ کو دہرائے۔ اس مقصد کے لیے یہ بھی ازبس ضروری ہے کہ وہ حسنِ ازلی پر دوبارہ بھرپور طریقے پر ارتکاز توجہ کرے تاکہ اس تعلق قلبی میں جو کمی واقع ہو گئی تھی وہ پُوری ہو جائے۔ جونہی وہ معصیت اور اس کے غلط اثرات کو

اپنے ذہن وقلب سے دھولیتا ہے، پھر انابت الی اللہ کے مراحل طے کرنے لگتا ہے۔ یہ تطہیری عمل جس کے ذریعے ایک عاصی انسان اپنے نفس کو پاک کرتا ہے "توبہ" یا رجوع الی اللہ کہلاتا ہے بطور ذہنی عمل رجوع یا توبہ کے چار اجزاء ہیں:

۱۔ غلطی اور معصیت کا اعتراف یعنی یہ احساس کہ جو کچھ اس نے چاہا یا کیا وہ انتہائی قبیح تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے تہہ دل سے اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی ہونا ضروری ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ط (التوبۃ: ۱۰۲)

ترجمہ: "اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔"

۲۔ خیال اور عمل دونوں کی سطح پر اس معصیت کو انجام نہ دینے کا عزم مصمم:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ط (التحریم: ۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے حضور میں توبہ کرو، خالص توبہ۔"

۳۔ معرفت الٰہی اور حبِّ الٰہی کو دوبارہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش اور اس کے لیے اخلاقی اصلاح کی حتی المقدور سعی۔

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (الانعام: ۴۸)

"پھر جو کوئی ایمان لایا اور اس نے (اپنے طرزِ عمل کی) اصلاح کر لی تو ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

۴۔ خالق حقیقی کی صفاتِ حسنہ پر تجدید ایمان اور اس حقیقت کا یقین کہ اس کا مربّی اور اس کی خودی کو بالیدگی اور نشوونما دینے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اسی تعالیٰ سے عفو و درگزر کا خواستگار ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسی کی خوشنودی اور رضا کے ساتھ حقیقی روحانی ترفّع حاصل کر سکتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ

يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء : ۱۱۰)

ترجمہ: اور جو شخص کوئی بُرا کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو بڑا مغفرت والا (اور) بڑا رحم کرنے والا پاتے گا۔"

توبہ کے محولا بالا ذہنی لوازم اُس وقت بطریقِ احسن پورے ہوتے ہیں جب ایک بندۂ عاصی تہہ دل سے قرآن میں سکھائی گئی یہ دعائیں پڑھتا ہے اور ان کے ایک ایک لفظ کا گہرا شعور حاصل کرتا ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف : ۲۳)

"اے رَبّ ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر (بڑا) ظلم کیا اور اگر تُو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔"

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۸۷)

"خدایا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں ہی قصوروار ہوں۔"

نفس اور روح کی مکمل تطہیر اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان اُن تمام خواہشات، تمنّاؤں اور افعال سے اجتناب نہیں کر لیتا جو اس کی فطرتِ سلیمہ کے خلاف ہیں اور ہر طرف سے منہ موڑ کر اس حسنِ ازلی کی طرف رُخ نہیں کر لیتا جس کی عبادت و محبّت کی خواہش اس کے وجود کی گہرائیوں سے پھوٹ رہی ہے۔

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ (المزّمّل: ۸)

ترجمہ: "اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو۔"

معصیت پر تہہ دل سے ندامت و پشیمانی اور خدا کے حضور گریہ و آہ و زاری کے ذریعے ایک سیاہ کار اپنے رَبّ کے بے پایاں فضل سے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ اپنا ٹوٹا ہوا ایمانی رشتہ دوبارہ استوار کر سکے۔ اور اسی طرح اس کی خودی دوبارہ مستحکم ہو کر شیطانی وسوسوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ مناجات اور آنسوؤں کے ساتھ خدا کے حضور دعائیں مانگنے کے لیے رات کا آخری حصّہ بالخصوص مفید ہے۔ کیونکہ اس وقت دن کی مشغولیات سے توجہ نہیں بٹتی اور انسان

پورے اطمینان، خشوع وخضوع اور حضوریٔ قلب کے ساتھ اپنے رب کے سامنے گڑگڑا سکتا ہے

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (المزمل: ۱-۴)

"اے کپڑے میں لپٹنے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔"

گناہ کی مقدار

اخلاقی اور روحانی اعتبار سے غلطیاں بڑی بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی۔ ان کی کمیت کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ خودی کو کتنا آلودہ کرتی ہیں اور منفی طور پر اس کو کتنا متاثر کرتی ہیں۔ کوئی گناہ یا معصیت خواہ بہت چھوٹی ہو، اگر مسلسل کی جائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ خودی کے ارتقاء کو زک پہنچائے۔ خودی کی محبّتِ حسن جوں جوں بڑھتی ہے غیر اخلاقی کام اس کی زندگی سے کم ہوتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کا صدور بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس سطح پر صحیح نصب العین اور اس کی محبّت مومن صادق کے شعور پر مکمل طور پر غلبہ پا لیتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اسے غلط افکار و اعمال سے اجتناب میں چنداں محنت نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ فطری طور پر اور نہایت سہولت کے ساتھ صرف اخلاقی اور نیک اعمال ہی کا صدور ہوتا ہے۔ غیر اخلاقی اور غیر مستحسن افعال کا ظہور اسی لیے ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کا جذبۂ محبت وقتی طور پر غلط سمت پر پڑ جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب حقیقی کی رفعت شان کا پورا ادراک نہیں ہوتا۔

غلط افکار کے منابع

صحیح نصب العین کے ساتھ متصادم باطل افکار کا منبع قوی عادات ہیں یا منہ زور جبلتیں۔

(ا) عادات: جب تک ایک شخص غلط نصب العین کے دام الفت میں اسیر ہے، اس

کی پوری زندگی اس کے زیرِ اثر رہتی ہے۔ نتیجتاً وہ فکر و عمل کی ایسی عادات متشکل کر لیتا ہے جو رفتہ رفتہ بہت پختہ ہو جاتی ہیں اور اس غلط نصب العین کی مقصد براری کرتی ہیں اور اپنی قوت کے بل پر اس شخص کے جذبۂ محبت کو سہارا دیتی ہیں۔ یہ عادات اس کے گلے کا ہار بن کر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں خواہ اس کی فطرتِ سلیم کی کچھ رمق ابھی باقی ہو حسن اور صحیح نصب العین کا شعور حاصل ہو جانے اور اس کی محبت کا وعدہ کر لینے کے باوجود یہ عاداتِ خبیثہ اس کے ذہن و عمل کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ ان سے چھٹکارا بلا واسطہ تصادم سے نہیں بلکہ ان کی جگہ ایسی عادات بنا لینے سے ہوتا ہے جو صحیح نصب العین کے مطابق ہوں۔ جوں جوں نئی صالح عادات گہری ہوتی جاتی ہیں، یہ پرانی غیر صحت مند عادات کی جگہ لے لیتی ہیں یہاں تک کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے نظامِ عبادات میں باقاعدگی اور بر وقت عمل پر انتہائی زور دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ (النسآء: ۱۰۳)

ترجمہ: بیشک نماز مسلمانوں پر پابندیٔ وقت کے ساتھ فرض ہے۔

اسی مضمون پر مشتمل مندرجہ ذیل حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ أَدْوَمُهَا (الحدیث)

ترجمہ: بہترین نیک عمل وہ ہے جسے پابندی اور باقاعدگی سے کیا جائے۔

جب ایک مومنِ صادق صحیح اور مطلوب عادات تشکیل دے لیتا ہے تو یہ عادات اس کی پوری عملی زندگی کا احاطہ کر لیتی ہیں اور وہ از خود محسوس کرتا ہے کہ اسے نہ صرف اپنی جملہ مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر اپنے حقیقی محبوب کی پرستش کرنی ہے بلکہ اپنی پوری زندگی کے تمام گوشوں میں اخلاقی ضابطے کی بھی پابندی کرنی ہے۔ جس طرح باطل عادات باطل محبت کا سہارا بنتی ہیں، اسی طرح عاداتِ محمودہ صحیح محبت کو برقرار رکھنے میں ممد ہوتی ہیں۔ ایک خاص کام کو بار بار کرنے سے اس میں ایک گونہ سہولت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ کام از خود اور شعوری کوشش کے بغیر انجام دیا جا سکتا ہے۔ فطرت کا یہ قانون انسان کی زندگی میں بہت کار آمد ہے۔ اس سے زندگی کے وہ گوشے بھی اخلاقی ضابطے کے تحت لائے جا سکتے

ہیں جن کے بارے میں ابھی فرد نے عادت صحیحہ استوار نہیں کی۔ جب تک عادات خبیثہ کا مکمل خاتمہ کر کے ان کی جگہ نیک عادات پوری طرح قائم نہیں ہو جائیں، صحیح نصب العین کے لیے جذبۂ محبّت کامل نہیں ہو سکتا۔

(ب) جبلتیں: وہ باطل افکار و خیالات بالخصوص بہت تیز و تند ہوتے ہیں جن کا منبع مختلف جبلتیں ہوتی ہیں مثلاً خورد و نوش کی جبلت، جنسی جذبہ، جارحیت پسندی، خود تحکمی وغیرہ وغیرہ کیونکہ خاص طور پر وہ جبلتیں جن کا ہدف فرد اور نسل کی صیانت ہوتا ہے، بہت قوی ہوتی ہیں ان کے پس پردہ ایک قسم کا حیاتیاتی جبر کار فرما ہوتا ہے اور اسی لیے ان کی تکمیل ایک مخصوص لذّت کا باعث بنتی ہے۔ صحیح نصب العین کے لیے محبّت کی عدم موجودگی میں ہم اپنی جبلّتی خواہشات کی لذّت سے اتنے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ہم اسی لذت کو تمام حسن و عظمت کا محور قرار دے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ خواہشات ہی ہمارا مطمع نظر اور ہدف یا نصب العین بن جاتی ہیں اور صحیح اور سچّے نصب العین کے لیے مختص محبّت بھی انہی خواہشات کی تکمیل کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ یہ تمام جبلتیں فی نفسہٖ غلط نہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ انہیں حد اعتدال کے اندر رکھا جائے۔ اور انہیں اسی حد تک پورا کیا جائے جس حد تک یہ صیانت ذات کے لیے ناگزیر ہیں۔ لیکن جب یہ خواہشات اور ان سے حاصل شدہ لذت اپنی جائز حدود سے تجاوز کر کے انسان کے ذہن و قلب پر پورے طور پر مستولی ہو جائیں تو پھر انسان حیوان کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ کیونکہ جانور بھی انہیں اپنی حیاتیاتی ضرورت سے زیادہ پورا نہیں کرتا۔ ایسے انسانوں کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ط (الاعراف: ۱۷۹)

ترجمہ: وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ

ان انسانوں کا نصب العین اور الٰہ ان کی خواہشات ہوتی ہیں:

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ ط (الفرقان: ۴۳)

ترجمہ: کیا تم نے اُس شخص (کے حال) پر بھی نظر کی جس نے اپنی خواہش (نفس) کو اپنا معبود بنا لیا؟

صاحبِ ایمان کا ایک اہم عمل ۔ مجاہدہ مع النفس

ایک ایسے شخص کو جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اپنی خودشعوری اور ایمانی کیفیات کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں خواہشات اور مرغوبات نفس کے ساتھ کشاکش کا سخت تجربہ ہوتا ہے۔ ان خواہشات کو اپنی جائز حدود میں مقید رکھنا اور صحیح نصب العین کے ساتھ عقیدت و محبت کے جذبات کی نشوونما محنت طلب امر ہے۔ اسے اپنی جبلّی خواہشات کو نہ صرف کنٹرول کرنے بلکہ انہیں دبانے کی اس حد تک مشق ہونی چاہیے کہ وقت آنے پر اور ضرورت کے پیش نظر اپنے عشق کی خاطر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جان کا نذرانہ بھی پیش کر سکے۔ اس صورتِ حال سے وہ ہر اس لمحے میں دوچار ہوتا ہے جب اسے اپنے نصب العین کے مخالف اعمال کا سامنا ہوتا ہے یا جب اسے جہاد فی سبیل اللہ میں بھوک پیاس اور دیگر تکلیف برداشت کرتے ہوتے حصّہ لینا ہوتا ہے اور جس میں وہ اپنی جان تک قربان کر دینا عین سعادت سمجھتا ہے۔

روزہ (صوم) کی اہمیّت

جبلّی و نفسانی خواہشات اور تقاضوں کے ساتھ کشمکش آسان امر نہیں لیکن ایک صاحبِ ایمان کی ان کے خلاف مسلسل کوشش اسے آسان بنا دیتی ہے۔ چونکہ وہ معصوم نہیں ہوتا اس لیے اس سے غلطی و گناہ کا صدور ہو جاتا ہے لیکن وہ ہر بار اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر اس سے رجوع کرتا ہے اور پہلے سے زیادہ عزم و ارادہ کے ساتھ اپنے نصب العین کی طرف مثبت پیش قدمی کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کا نظامِ عبادات اس داخلی کشمکش میں ثابت قدمی کی مشق بہم پہنچاتا ہے۔ بالخصوص سال میں ایک بار مسلسل ایک ماہ کے روزے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دن کے اوقات میں ایک ماہ کے روزے اسے اپنی نفسانی خواہشات کو کنٹرول اور دبانے کی خوب تربیت دیتے ہیں۔ جوں جوں وہ روزے کے ذریعے اپنے نفس کی گرفت کو ڈھیلا کرتا ہے۔ اسی قدر حسنِ ازل کے ساتھ حقیقی محبّت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ چنانچہ وہ جس حد تک اپنے نفس کے تقاضوں کو دبا سکتا ہے، اسی قدر نصب العین کے ساتھ محبّت بڑھ سکتی ہے۔

روزے سے حاصل کردہ روحانی ترفع زندگی میں ہر لمحے شیطانی وسوسوں کے خلاف زبردست ڈھال کا کام کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے نفس پر مکمل قابو پاکر اپنے نصب العین کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور اخروی کامیابی سے بھی ہمکنار ہوتا ہے۔ سفلی جذبات کے چنگل سے نکل کر ہی ایک صاحبِ ایمان اس ذہنی و قلبی کیفیت کا احساس کر سکتا ہے جس میں وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر حسنِ ازل سے رشتۂ محبّت استوار کرتا ہے۔ یہ ذہنی و قلبی سکون صرف انہی سعید روحوں کو ملتا ہے جو بالآخر اپنے رب کے انعام یعنی جنّت الفردوس کو پاتے ہیں:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ
بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (السجدة: ۱۷)

ترجمہ: تو کسی متنفّس کو علم نہیں کہ کیسا کیسا آنکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) ان کے لیے (خزانۂ غیب میں) مخفی ہے۔ یہ ہے صلہ ان کے (نیک) اعمال کا۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝
فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ (النّٰزعٰت:- ۴۰-۴۱)

ترجمہ: اور جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا ہو اور اس نے (اپنے) نفس کو (بُری) خواہشات سے روکا ہو، تو یقیناً بہشت ہی اس کا ٹھکانا ہے

پروفیسر جیمز نے اخلاقی عمل کی تعریف ہی یوں کی ہے کہ یہ وہ عمل ہے جسے سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خودی کے ارتقائی مراحل میں وہ مرحلہ بھی آتا ہے جب اخلاقی عمل کو کم سے کم مزاحمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ صحیح نصب العین کے ساتھ محبّت کا دعویٰ عمل کی دنیا میں ہی پرکھا جاتا ہے اور اگر یہ جذبہ صادق ہو تبھی اس میں اعلیٰ مدارج کے حصول کی صلاحیّت ہوتی ہے۔ سفلی اور نفسانی خواہشات کے علی الرغم اخلاقی عمل کو کامیابی سے انجام دینا ہی انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح نصب العین کے ساتھ اپنی محبّت کو پروان چڑھا سکے۔ مشکلات میں صبر و مصابرت انسان کو خواہشات کے مقابلے میں نصب العین کو ترجیح دینے کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَوٰةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ

اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ (البقرۃ : ۴۵)

ترجمہ: اور صبر اور نماز کا سہارا پکڑو! اور البتہ یہ شاق ہے مگر ان پر (نہیں) جو عاجزی کرتے ہیں۔

صبر کے ساتھ ساتھ اب کریم کے حضور میں دعا و مناجات سے ایک فرد روحانی ارتقا میں حائل موانع اور مشکلات پر قابو پا سکتا ہے۔ شیطان کے وساوس ہر دم اس کا پیچھا کیے رہتے ہیں۔ اور اس صورت میں وہ صرف صبر اور نماز کے ذریعے ہی اپنے نصب العین کی طرف استقامت کے ساتھ گامزن رہ سکتا ہے۔ قرآن مندرجہ ذیل آیات میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (البقرۃ : ۱۵۵-۱۵۶)

ترجمہ: اور ہم تمہاری آزمائش کر کے رہیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال و جان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے، اور صبر کرنے والوں کو بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آن پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کا طریقہ

غلط خیالات و تصوّرات کی فتح نہ صرف ایک فرد کی نصب العین کے ساتھ عشق و محبّت کو نقصان پہنچاتی ہے، وہ اسی کی ذہنی صحت کے لیے بھی مُضر ہے۔ متعدد اعصابی عوارض (مثلاً ہسٹریا، پریشانی، وہم، خبط اور پاگل پن وغیرہ) کا سبب مریض کے خیالات و خواہشات اور اس کے نصب العین میں تصادم ہوتا ہے۔ جب ایک باطل خیال اس کے ذہن پر چھا جاتا ہے اور وہ اس کے مطابق عمل بھی کر لیتا ہے۔ تو اگرچہ اسے اپنی وقتی نفسانی خواہش کی تکمیل پر ایک گونہ لذّت کا احساس ہوتا ہے لیکن فوراً بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے

صحیح نصب العین سے دُور ہٹ گیا ہے۔ اس پر سخت ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے اور بعض اوقات احساسِ گناہ کی شدّت اس میں ذہنی تصادم اور شکستگی کی کیفیّت پیدا کر دیتی ہے صدقِ دل کے ساتھ کی گئی توبہ ہی اس صورتِ حال کا صحیح واحد حل ہے۔ سچّی توبہ ہی ذہنی تصادم اور اس کے اثرات کو رفع کر سکتی ہے لیکن اگر ایک صاحبِ ایمان روحانی ترفع کے اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے جہاں وہ شیطانی وسوسوں میں گرفتار نہیں ہوتا، تو وہ ان تمام ذہنی عوارض سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

عشقِ الٰہی یا خود آگہی کے ارتقاء کی کوئی انتہا نہیں

انسانوں میں محبّت کی صلاحیّت مختلف ہوتی ہے۔ بعض دُوسرے کوائف یکساں ہوں تب بھی اس کا انحصار کسی فرد کی ذہانت پر ہوتا ہے۔ اعلیٰ ذہنی سطح کے لوگوں کو حسن ازلی کی جستجو بہت شدید ہوتی ہے اور وہ اس سے ہر چاہت سے زیادہ جذباتی اور گہری محبّت کر سکتے ہیں۔ ایک صاحبِ ایمان شخص کو اپنی فطری صلاحیّت کے مطابق جذبۂ عشق کو بڑھانا چاہیے۔ جب تک اس کا پورا عمل نصب العین کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہو جاتا، اسے سمجھنا چاہیے کہ اس کے قلب و ذہن میں ابھی باطل نظریات کا اثر ہے اور وہ اس کے عمل اور جذبۂ محبّت کے کچھ حصّے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اور یہ کہ اسے ابھی مسلسل اپنے جذبۂ محبّت اور عمل کو صحیح نصب العین کے لیے خالص کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی فرد کے حُبِّ الٰہی کا جذبہ اس دنیاوی زندگی میں خواہ کتنا ہی بلند مقام حاصل کر لے، یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ اس نے خالقِ حقیقی کے حسن کا کما حقہٗ ادراک حاصل کر لیا ہے۔ اس جذبہ و شوق کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اور کسی سطح پر بھی ایک مومن یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے آخری حد کو چھُو لیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قول مبارک ہے۔

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ (حدیث)

ترجمہ: ہم تجھے پہچان نہ سکے۔ جیسا کہ تیری پہچان کا حق ہے۔

جسمانی موت کے بعد بھی خودی کا ارتقا جاری رہتا ہے

یہی وجہ ہے کہ ایک مومن صادق کی محبّتِ الٰہی میں موت کے بعد بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ جسم کی تخلیق خودی کی خلاقی کا مظہر ہے نہ کہ جسم سے خودی وجود میں آتی ہے، خودی جسمانی موت کے بعد کسی قسم کے تعطل یا عدم وجود کا شکار نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اگلی زندگی میں بھی اپنی فطری بنیادی خصوصیت کے ساتھ باقی رہتی ہے یعنی حسن ازلی کی تلاش اور اس سے محبّت۔ چنانچہ یہ روحانی ارتقاء حیات بعد الممات میں بھی جاری رہتا ہے اور نور الٰہی سے کسبِ نور کا عمل بھی ختم نہیں ہوتا۔ صاحب ایمان حضرات اگلی زندگی میں خدا سے دعا کریں گے کہ وہ ان کی خود آگہی کا نور مکمل کر دے اور ان سے وہ موانع دُور کر دے جن کی وجہ سے وہ اپنی پہلی زندگی میں روحانی بالیدگی مکمل طور پر حاصل نہ کر سکے۔ وہ اپنی ان بداعمالیوں پر اللہ کی جناب میں نادم ہوں گے جن کی وجہ سے وہ دنیا میں حسن ازلی کے ساتھ محبّت کما حقہٗ نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کی دعا یہ ہو گی :۔

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

(التحریم : ۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے کامل کر دے اور ہماری مغفرت فرما بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

مومن صادق کی اُخروی زندگی

لیکن وہ مومن صادق جو صحیح نصب العین کے لیے اپنا جذبۂ عشق و محبّت اس دنیا میں آخری حد تک بڑھا سکا اور موت تک اسے برقرار بھی رکھ سکا۔ حیاتِ اخروی میں اسی جذبۂ محبّت کے مزید ارتقاء میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرے گا۔ چونکہ دنیوی زندگی میں اس نے اپنے نفس اور شیطان کے تمام وساوس پر قابو پا لیا تھا، اس لیے اب آخرت میں اسے مزید تگ و دو نہیں کرنی۔ حیات دنیوی میں کی گئی محنت سے اس نے وہ نور کما لیا ہو گا جو حیات بعد الممات

کے مراحل میں اس کے کام آئے گا اور اس کے آگے آگے اس کا راستہ منوّر کیے رکھے گا۔ وہ بغیر کوشش کے باری تعالیٰ کے نئے نئے جلوے ہر دم ملاحظہ کرے گا:

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (الحدید: ۱۲)

ترجمہ: اُن کا نور اُن کے آگے آگے دوڑتا ہوگا۔

لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ط (الحدید: ۱۹)

ترجمہ: اُن کے لیے اُن کا اجر اور اُن کا نور ہے۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (التحریم: ۸)

ترجمہ: اُن کا نور اُن کے آگے دوڑتا ہوگا۔

رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ج (التحریم: ۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہماری مغفرت فرما۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حزن اور خوف سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ کسی شخص کو حزن اس وقت ہوتا ہے جب اسے اس کی مطلوبہ شے نہ ملے اور خوف اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو مقررہ معیار پر آتا نہ دیکھے۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں انسانی خودی کی اصل اور بنیادی خواہش ایک ہی ہے اور وہ خواہش حسنِ ازلی کے حصول کی ہے۔ چنانچہ جب اس خواہش کے لوازم دنیوی زندگی میں مسلسل پورے کرتے ہوئے ایک فرد اگلی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی روح اس منزل کی تمام سختیاں جھیلنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اسے کسی قسم کے حزن یا خوف سے واسطہ نہیں ہوتا:

اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۷۰)

ترجمہ: کہ اُن پر نہ تو کسی قسم کا ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

درحقیقت جنت کی تمام نعمتوں اور ان سے لطف اندوزی کا انحصار اپنی کیفیات پر ہے۔ ایک گناہ گار بندے کا معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ چونکہ وہ دنیوی زندگی میں اپنی فطرت کی آواز پر لبیک کہہ کر اپنی خودی کی تعمیر نہیں کرتا بلکہ معصیتوں اور سیاہ کاری میں ملوّث ہو کر اپنی خودی کو آلودہ کر لیتا ہے۔ اس لیے آخرت میں بھی اسے سخت حزن و خوف سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر وہ پہلی زندگی

میں معصیتوں کے ارتکاب کے بعد توبہ (اپنی تمام شرائط کے ساتھ) کر کے اپنے گناہوں کا ازالہ کر لیتا ہے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ اسے اگلی زندگی میں ان کا کفارہ بھرنا پڑتا ہے۔ اور جب تک وہ اس سخت تکلیف دہ مرحلے سے گزر کر اپنی خودی کو آلودگیوں سے پاک نہیں کرتا، اس کا روحانی ارتقاء رُکا رہتا ہے۔ آخرت میں خودی کی تطہیر کا عمل انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دوزخ کے عذاب کی مختلف شکلیں اور ان کی تفصیلات اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

جنّت کی نعمتیں اور دوزخ کے مصائب صرف استعارے نہیں ہیں

ہر شخص اگلی زندگی میں اپنی ذہنی سطح اور کیفیّت کے مطابق اپنی جنّت اور دوزخ خود بنائے گا۔ اس سلسلے میں اصل اہمیّت اِس مادّی دنیا میں کمائے ہوئے اعمال کی ہوگی جس کے اثرات اس کے لاشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور جس کی پوٹلی باندھ کر وہ اگلی زندگی میں قدم رکھے گا۔ اس ابدی زندگی میں اسے اپنے کسب شدہ اعمال کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔ یا تو مثبت طور پر وہ اس کے کام آئیں گے یا پھر سخت تکلیف دہ عواقب برداشت کرنا ہوں گے۔ وہاں پر اسے ان تمام لوگوں سے واسطہ پڑے گا جن کے حقوق اس نے اس دنیا میں غصب کیے ہوں گے۔ خود اس کے اعضاً وجوارح کو زبان دے دی جائے گی جو اس کے خلاف شہادت پیش کریں گے۔ اگر دنیا میں اس کے اعمال اس کی فطرتِ سلیمہ اور خالقِ کائنات کی مرضیّات کے مطابق ہوں گے تو اسے اگلی دنیا میں نہایت خوشگوار لوگوں کی معیّت اور نہایت دیدہ زیب اور دلفریب مناظر واشیاء سے نوازا جائے گا۔ مثلاً باغات، مرغوب کھانے اور لذیذ مشروبات، خوبصورت ساتھی، نہریں اور سایہ دار ثمر اشجار وغیرہ۔ اس جنّت کی نعمتیں دنیا میں کمائے ہوئے اعمال اور اخلاقی جدّوجُہد کے تناسب سے ہوں گی۔ کسی شخص نے جس درجے میں اپنے خالقِ حقیقی کی صفتِ حسن کو اپنے اخلاق واعمال میں اپنایا ہوگا وہ اسی قدر نعمتوں کا مستحق ہوگا۔ اور آخرت کی زندگی میں بھی اس کی خودی کی بالیدگی اور ترفع کا عمل جاری رہے گا۔

اور اگر اِس زندگی میں کسی شخص کے اعمال اس کی فطرتِ سلیمہ اور خالقِ کائنات کے احکام

کے خلاف ہوں گے تو اسے اپنے اعمالِ بد کو انتہائی کریہہ صورتوں میں متشکل دیکھنا پڑے گا مثلاً آگ کی لپیٹ، انتہائی گندہ اور ناپسندیدہ پانی، ناکارہ اور بدذائقہ غذا، جسمانی تعذیب، سانپ، بچھو وغیرہ۔ وہ ان سب سے بھاگنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کا کچھ بس نہ چل سکے گا۔ اسے موت بھی آکر ان تکالیف سے چھٹکارا نہیں دلا سکے گی۔ چنانچہ جنّت اور دوزخ اور ان کی تفاصیل صرف خالی استعارے نہیں بلکہ واقعی اور حقیقی مقامات ہیں جو اگرچہ متشکل ان اعمال کے نتیجے کے طور پر ہوں گے، جو ہم اس دنیوی زندگی میں کرتے ہیں اور جن کے اثرات ہمارے لاشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ یہی اعمال حیاتِ اُخروی میں معروضی کیفیات اور مقامات کا رُوپ دھار لیں گے جو یا تو انتہائی آرام دہ اور خوش کن ہوں گے یا انتہائی تکلیف دہ اور مضرت بخش۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ ایک مومن جس نے دنیا میں تھوڑے بہت نیک کام کیے ہوں گے وہ آخر کار جہنّم سے اس کی گلوخلاصی کا باعث بنیں گے۔ اور اس طرح دوزخ کے مصائب سہتے ہوتے بھی اس کی روح کی بالیدگی کا سبب بالآخر وہ اعمالِ خیر بنیں گے جو اس نے دنیا میں کیے ہوں گے۔ اس نے صحیح نصب العین کے لیے جتنے زیادہ عمل کیے ہوں گے اتنی جلدی اسے جہنّم کی آگ سے نجات ملے گی۔ اس طرح یہ اعمال وہ نور بن جائیں گے جو سیاہ کاریوں کے اندھیاروں کو ختم کر دیں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (ھود : ۱۱۴)

"بے شک نیکیاں گناہوں کو دُور کر دیتی ہیں۔"

غلط نصب العین سے محبّت کرنے والے کا انجامِ بد

جو شخص پیغمبروں کی ہدایات پر کان نہ دھرتے ہوئے کسی غلط نصب العین کو اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح پُوری زندگی میں غلط روش پر چلتا ہے، وہ آخرت میں نہایت المناک انجام سے دوچار ہوگا۔ بالخصوص اگر حیاتِ دنیوی کے اختتام یعنی موت کے وقت بھی وہ غلط نظریات اور عمل پر کاربند ہے تو اس کی روح کی صحیح سمت میں ترقی و بالیدگی کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَاسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ ؕ وَکَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝

(الاعراف: ۴۰)

"یقیناً جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلے میں سرکشی کی اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ ہی وہ جنّت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ اُونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے، اور ہم مجرموں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔"

وَمَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰهِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (الحج: ۳۱)

اور جو اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرائے تو (اس کا حال ایسا ہے کہ) جیسے وہ آسمان سے گر پڑا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ج (النساء: ۴۸)

اللہ یہ کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک گردانا جائے۔ ہاں اس کے سوا (جتنے گناہ ہیں)، وہ جس کو چاہے معاف کر دے۔

شرک ایسا گناہِ عظیم ہے جسے اللہ تعالیٰ کبھی نہیں بخشتا۔ ایک مشرک کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہوتا کہ وہ دوزخ کے عذاب سے نجات حاصل کر سکے۔ چنانچہ اس کی روح ہمیشہ کے لیے اندھیاروں میں بھٹکتی ہے اور اسے نور یا روشنی کی کوئی رمق کبھی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ابدالآباد تک اپنے اعمال سے کسب شدہ اندھیرے میں گھری رہتی ہے۔ جس طرح وہ دنیوی زندگی میں اندھیرے اور حجاب میں رہی، اسی طرح آخرت میں بھی تیرہ شبی اس کا مقدر بنتی ہے:

وَمَنۡ کَانَ فِیۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰی فَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰی وَاَضَلُّ سَبِیۡلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۲)

اور جو اِس (دنیا میں) اندھا بنا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور راہِ (نجات) سے بالکل بھٹکا ہوا۔

ایسے شخص نے اپنے تئیں خواہ کسی عمل کو کتنا ہی بھلا اور اچھا سمجھا ہو، یا اسے فلاحِ عام اور انسانیت دوست جذبے کے تحت انجام دیا ہو، حیاتِ اُخروی میں وہ (ایمان باللہ کے بغیر) کسی کام کا نہ ہوگا۔ چونکہ اس کا مطمحِ نظر یا نصب العین غلط تھا اس لیے یہ بظاہر اچھے کام بھی اسی غلط نصب العین کی مقصد براری کرتے ہوئے اس کے حقیقی روحانی ترفع میں بالکل ممد نہ ہوں گے۔ چونکہ ان تمام افعال کے پسِ پردہ اللہ کی رضاجوئی کا جذبہ کارفرما نہ تھا اس لیے آخرت میں قطعاً نتیجہ خیز نہ ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں متعدد بار ارشاد ہوتا ہے:

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ (الکہف: ۱۰۵)

سو ان کے اعمال اکارت گئے۔ پس ہم قیامت کے دن ان کے لیے ترازو کھڑی ہی نہیں کریں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۚ (النور: ۳۹)

اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی اُن کے اعمال تو دشت (بے آب) میں سراب کی مانند ہیں جسے پیاسا پانی سمجھ بیٹھتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ (ابراہیم: ۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کی روش اختیار کی اُن کے اعمال کی مثال راکھ (کے ڈھیر) کی سی ہے جسے آندھی کے روز ہوا لے اڑے۔ جو کچھ انہوں نے (اپنے نیک اعمال کے ذریعے دنیا میں) کمایا ہے اس میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ آئے گا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ (الکہف: ۱۰۳، ۱۰۴)

(اے پیغمبر ان سے) کہو کہ کیا ہم تمہیں ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں؟ (یہ) وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی

گیئیں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت خوب کام کر رہے ہیں۔

مندرجہ بالا تشریحات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جنّت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کا آغاز اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ ایک صحیح العقیدہ اور نیکو کار مسلمان اسی دنیا میں اگلی زندگی میں ملنے والی جنّت کے مسرّت و آرام کا کچھ تجربہ حاصل کرنے لگتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک ایمان سے تہی دست شخص دنیوی زندگی ہی میں دوزخ کی تکالیف اور سوزش کا مزہ چکھنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک بندۂ مومن دنیوی زندگی کے دوران اپنے نفس اور شیطان کے حملوں کے خلاف ہر وقت چوکس رہتا ہے، اس لیے وہ اپنے رب کی نعمتوں کو پورے طور پر اُخروی زندگی ہی میں دیکھے گا۔ ایک کافر کی روش اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ اپنے رویّے میں صحیح نصب العین اور اس کے تقاضوں کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا، چنانچہ اس کا عمل تقویٰ اور اخلاقی حدود کو پامال کر دیتا ہے۔ اور دنیا کی عارضی لذّتوں میں کھویا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک فرمان اسی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ۔ (الحدیث)

دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنّت ہے۔

تحلیلی نفسیات کی مثبت شہادت

تحلیلی نفسیات دان بھی اس بات کے قائل ہیں کہ ہر انسانی عمل (بشمول خواہشات) ہمارے لاشعور کا مستقل حصّہ بن کر محفوظ ہو جاتا ہے۔ متعدد تحلیلی نفسیات دان اس امر کا مدلّل ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ہر انسانی حرکت اور عمل کا ایک اثر اس کے ذہن اور خودی پر پڑتا ہے اور یہ ذہنی کیفیت اور اثر اس کے لاشعور میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ امتدادِ زمانہ سے ان اثرات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ان اثرات سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنِ انسانی کا لاشعوری حصّہ بالکل مختلف اصولوں کے تحت علیٰحدہ وجود رکھتا ہے اس میں بیک وقت متضاد نشاناتِ عمل محفوظ ہو سکتے ہیں اور وہ منطقی قوانین کے مطابق ایک دوسرے کو ختم نہیں کرتے بلکہ متضاد اور باہم مخالف اثرات اس میں ایک ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ شعوری زندگی کے بعض انتہائی غیر

اہم اور بھولے بسرے واقعات کے ارتسامات بھی اس لاشعور میں محفوظ رہتے ہیں۔ حالانکہ شعوری زندگی میں ان کے وقوع پذیر ہوتے ہوئے ہم نے انہیں قطعاً اہمیّت نہیں دی ہوتی لیکن یہی واقعات ہمارے ذہن کے پردے پر آکر خوابوں کا علامتی رُوپ دھار لیتے ہیں۔ اس حقیقت کا مزید ثبوت ہپناٹزم کے عمل سے ملتا ہے جس میں ہپناٹزم کا ماہر اپنے معمول پر نیم خوابی کی سی کیفیّت طاری کر کے اس کے لاشعور میں گہری اتری ہوئی یادوں کو شعور کے سطح پر لے آتا ہے اور سوالات کے ذریعے ان کا اظہار کرواتا ہے۔ فرائڈ رقم طراز ہے۔

"اِڈ، (لاشعور) میں تصوّرِ زماں کے متبادل کوئی خیال نہیں ہوتا اور وقت کے گزرنے کے سلسلے میں بھی اس میں کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ ذہنی کیفیات کے آنے جانے میں بھی زمانی تغیّر کا احساس ، اِڈ، میں جگہ نہیں پاتا۔

یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو رہی ہے کہ ہم نے دبی ہوئی خواہشات کے لاشعور میں چلے جانے اور اس ضمن میں امتدادِ زمانہ کے غیر حقیقی ہونے کا بہت کم ادراک کیا ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ اس سے بہت سے حقائق کو سمجھنے کی کلید ہمارے ہاتھ آسکتی ہے۔ اگرچہ خود میں ابھی اس خیال کو مزید آگے نہیں بڑھا سکا ہوں"۔

ان علمی تصریحات کی روشنی میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ انسان کے وجود کے کسی حصّے میں (جس کا اسے شعور نہیں) اس کے تمام اعمال درج کیے جارہے ہیں اور یہ ریکارڈ بالکل درست اور ہر دم خواہی نخواہی اس کے ساتھ رہتا ہے۔ انسان کے اعمال کے ہر لحظہ ریکارڈ کی طرف قرآن کریم کے ان الفاظ میں اشارہ ہے:

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَـٰهُ طَـٰٓئِرَهُۥ فِى عُنُقِهِۦ ۖ (بنی اسرائیل: ۱۳)

اور ہم نے ہر انسان کا صحیفۂ عمل اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے۔

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَـٰفِظِينَ ۝ كِرَامًا كَـٰتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝ (الانفطار: ۱۰-۱۲)

اور یقیناً تم پر (ہماری طرف سے) نگران مقرر ہیں، معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

ذہن انسانی کا لاشعوری حصّہ دراصل اس کی شخصیّت یا خودی ہے۔ کیونکہ جسے ہم شعوری ذہن کہتے ہیں وہ لاشعوری ذہن کا صرف ایک چھوٹا سا حصّہ ہوتا ہے۔ انسان کے جسم اور ذہن کی ساخت اور مادّی اجزاء کی مسلسل تبدیلی کے باوجود اس کے لاشعور میں محفوظ اعمال کا ریکارڈ بغیر کسی کمی بیشی یا تبدیلی کے جاری رہتا ہے اور جیسا کہ ماہر نفسیات فرائڈ کا بھی خیال ہے یہ قدرت کا ایک نہایت اہم انتظام ہے۔ قرآن اسی حقیقت کے ضمن میں مندرجہ ذیل صراحتیں پیش کرتا ہے:

(ا) زمانی اور مکانی قوانین کا اطلاق صرف جسم انسانی پر ہوتا ہے۔ انسانی خودی (روح) جسم سے علیحدہ وجود رکھ سکتی ہے۔ صرف روح لافانی ہے۔

(ب) خودی کے حیاتِ دنیوی کے اعمال کے نتائج مسرّت و خوشی یا تکالیف اور شدائد کی شکل میں اگلی زندگی میں نکلیں گے۔

(ج) اچھے یا بُرے نتائج کے ساتھ خودی کا استحکام یا ارتقاء حیات بعد الممات میں جاری رہے گا۔

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات اس ضمن میں قابلِ غور ہیں۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا ط
اَحْصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوهُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (المجادلۃ : ۶)

اُس روز جب اللہ ان سب کو (جلا) اٹھائے گا، پھر انہیں جتلا دے گا جو کچھ وہ کرتے رہے۔ اللہ نے تو اِسے (یعنی ان کے اعمال کو) شمار کر رکھا ہے اور وہ خود اِسے بھول گئے ہیں۔ اور اللہ تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ
اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (المومنون : ۱۱۵)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں (یونہی) بیکار پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تمہیں ہماری طرف لوٹ کر نہیں آنا ہے؟

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ط وَلَا يَظْلِمُ
رَبُّكَ اَحَدًا ۝ (الکہف : ۴۹)

اور جو کچھ انہوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (اپنے سامنے) موجود پائیں گے۔ اور تمہارا رَبّ کسی پر (ذرا بھی) ظلم نہیں کرتا۔

انسانی وجود کے لاشعوری حصّے میں اس کے کیے ہوئے تمام اعمال (خواہ کوئی عمل کتنا ہی چھوٹا اور کتنا ہی چھپ کر کیا گیا ہو) کا محفوظ ریکارڈ قیامت کے دن اس کی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ تاکہ وہ خود اُس کو دیکھ لے اور اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے بلفظِ آیت قرآنیہ:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ ؕ (بنی اسرائیل: ۱۳)

اور ہم نے ہر انسان کا صحیفۂ عمل اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے۔

اس دن ہر شخص اپنے نامہ اعمال کو دیکھ کر اپنے انجام کو جاننے کے لیے کافی ہوگا۔ جیساکہ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے:

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۴)

پڑھ اپنا اعمال نامہ، آج تو خود ہی اپنے خلاف حساب کرنے والا کافی ہے!

قیامت کے دن جب ہر شخص اپنا نامہ اعمال دیکھے گا تو یہ جان کر ششدر رہ جائے گا کہ دنیوی زندگی کے دوران کیا ہوا انتہائی چھوٹا عمل بھی اُس میں درج ہے اور یہ کہ کوئی عمل بھی اس سے باہر نہیں رہا۔ چنانچہ عالمِ حیرت میں کفِ افسوس ملتا ہوا پکار اُٹھے گا:

مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ج (الکہف: ۴۹)

یہ کیسا نوشتہ ہے کہ اس نے نہ تو کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ ہی بڑی چیز کو، مگر سب کو شمار کر لیا ہے۔

خواہ کوئی عمل کتنا ہی چھوٹا اور اُس کی دانست میں بے وقعت کیوں نہ ہو، اس روز اس کی جواب دہی اسے کرنا ہوگی اور مکافاتِ عمل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بلفظِ آیتِ قرآنیہ:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۷، ۸)

تو جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اُسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی ہوگی تو وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔

حیاتِ اُخروی کی خواب کے تجربات سے مشابہت

حیاتِ اُخروی کے تجربات کی نیند کے دَوران خواب میں دیکھے جانے والے مناظر اور تجربات سے ایک درجے کی مماثلت ہے۔ خواب کے دَوران انسان کا وہ شعور جو ان تجربات سے گزرتا ہے، اس کے مادّی جسم سے بالکل لاتعلق ہوتا ہے۔ انسان کا جسم نیند کی حالت میں بستر پر دراز آرام کر رہا ہوتا ہے جبکہ انسانی شعور کسی اور غیر مرئی جسم کو استعمال کرتے ہوئے خواب میں مختلف تجربات اور احساسات کو محسوس کرتا ہے۔ اور ان تجربات سے متعلقہ غمی، خوشی یا خوف کے جذبات بتمام و کمال محسوس کرتا ہے اور اشیاء اور انسانوں کو دیکھتا اور ان کا بھرپور تجربہ حاصل کرتا ہے۔

خواب کے تجربات کے دَوران انسانی خودی اپنے مادّی حصّے یعنی جسم سے کلیتاً منقطع ہوتی ہے۔ اس کی بعینہٖ یہی حالت موت کے بعد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نیند کو موت سے مشابہ بیان کرتا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ (الزمر: ۴۲)

وہ اللہ ہی ہے جو ان کی موت کے وقت رُوحیں قبض کر لیتا ہے اور جو ابھی مرا نہیں اس کی رُوح نیند میں (قبض کر لیتا ہے)

فرق یہ ہے کہ خواب کے تجربات کا تعلّق اکثر و بیشتر ہمارے مستقبل سے ہوتا ہے جبکہ اُخروی زندگی ہمارے ماضی یعنی دنیوی کا عکس ہوگی۔ حیاتِ دنیوی کے جملہ تجربات و افعال جو ہمارے لاشعور میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں، قیامت کے دن بالکل اسی طرح ہمارے

سامنے کھول کر رکھ دیئے جائیں گے جس طرح فلم کی ریل میں مناظر بند ہوتے ہیں اور اسے پروجیکٹر میں لگا کر بعد میں کسی وقت تمام مناظر کو پردہ سیمیں پر دیکھا جا سکتا ہے۔

حیاتِ دنیوی میں خودی کے ارتقا کی اعلیٰ ترین سطح

جُوں جُوں ایک صاحبِ ایمان شخص کی صحیح نصب العین کے لیے محبت بڑھتی ہے، اسی قدر اسے اطمینان اور مسرّت کا احساس زیادہ ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات عبادت یا مراقبے کے دوران اسے ایسی کیفیت کا احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ حسنِ ازل کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ اس کی صورت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ایک لوہے کی سوئی مقناطیس کی طرف کشش رکھتی ہے۔ اس کشش میں بعض اوقات کششِ ثقل سے بھی زیادہ کھچاؤ ہوتا ہے۔ اس روحانی تجربے میں جو لذّت اور وجد کی کیفیت محسوس کی جاتی ہے کوئی دوسرا تجربہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کیفیت میں ایک سالک اپنے محبوب کا بلاواسطہ دیدار کرتا ہے اور اس کی خودی اس تجربے میں پوری طرح محو ہوتی ہے۔ اس مقام پر وجود باری تعالیٰ کی معیت کا احساس اس قدر پر کیف ہوتا ہے کہ کوئی بھی اس کیفیت سے نکلنا تکلیف دہ پاتا ہے لیکن حق تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول ہی کے لیے ایک صاحبِ ایمان اس روحانی تجربے سے باہر آ کر زیادہ ہمّت اور عزم کے ساتھ خلقِ خدا کو اس صراطِ مستقیم پر لگانے کی کوشش کرتا ہے جس کا حکم اسے ملا ہے۔ دینِ حق کی یہ دعوت اس کے صحیح نصب العین کے ساتھ محبّت کا ہمیشہ اہم جزو بنی رہتی ہے۔ مذکورہ بالا روحانی تجربے کے بعد ایک صاحبِ ایمان زیادہ شوق اور جذبے کے ساتھ دینِ حق کی سربلندی کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ روحانی تجربہ بڑا مختصر ہوتا ہے لیکن ایک مردِ حق کو اس کا تجربہ مراقبے اور عبادت میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اس تجربے کے اس کی آئندہ زندگی پر مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں:

(۱) اسے دلی مسرّت و انبساط اور اطمینانِ قلب کی ایک کیفیت حاصل رہتی ہے۔ گویا اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود اور اس کائنات کا راز پا گیا ہے اور ان کی معنویّت اس پر عیاں ہو گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرّعد : ۲۸)

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو، اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (حٰمٓ السجدة : ۳۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر (اس پر) جمے رہے اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (یہ کہتے ہوئے کہ) نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ۔

(۲) اس میں ضبطِ نفس اور خود شعوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو چھوٹے سے چھوٹے گناہ اور معصیت سے بھی بچاتا ہے۔ اس کی خود آگہی ترقی کی اعلیٰ ترین سطح پر پہنچ جاتی ہے۔

(۳) چونکہ اس کے ذہن وقلب میں خوف وشک کا کوئی شائبہ بھی نہیں رہتا اس لیے اس میں بے پناہ قوّتِ عمل پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کمر کس لیتا ہے۔ اس کی شخصیّت ایک متحرک اور فعال شخصیّت بن جاتی ہے اور وہ پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات نافذ کرنے کی بھرپور جدّ وجہد کرتا ہے۔ اقامتِ دین کے عظیم کام کے لیے وہ اپنے آپ کو نفسیاتی، اخلاقی اور علمی طور پر تیار کرتا ہے اور اپنے کردار کو خوب مضبوط بناتا ہے۔ اور یہ تمام صفات وہ اپنے اعلیٰ روحانی تجربے اور پاکیزہ باطنی کیفیات کی وجہ سے ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

(۴) وہ ان اوامر ونواہی پر سختی سے کاربند رہتا ہے جن پر عمل کے ذریعے ہی وہ خود آگہی اور خداشناسی کے اس بلند مقام تک پہنچتا ہے، جہاں وہ اس کی روحانی برکات سے متمتع ہوتا ہے۔ وہ حیاتِ دنیوی کے آخری دم تک تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی اس روش پر قائم رہتا ہے۔

(۵) چونکہ اس کے مقاصدِ حیات اپنے خالقِ حقیقی کے مقاصد کے ساتھ مکمل طور پر مطابقت

اختیار کر لیتے ہیں اس لیے اس کی مرضی اور ارادے میں حق تعالیٰ کی مشیت شامل ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کے اعضاء و جوارح سے وہی افعال انجام پاتے ہیں جو خالقِ حقیقی کو پسند ہوتے ہیں۔

خالقِ حقیقی کا بلاواسطہ مشاہدہ۔ (احسان)

کیا ذاتِ حق تعالیٰ کا بلاواسطہ مشاہدہ اور دیدار ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب اس صورت میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب ہم اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اشیاء کے ادراک و مشاہدے کے عمل کو سمجھ لیں۔ خارجی شے سے آنے والی روشنی کی شعاعیں جب ہماری آنکھ کے پردے پر پڑتی ہیں تو پتلی سے گزرنے کے بعد وہ اس شے کا عکس آنکھ میں بناتی ہیں۔ اس عکسی تصویر کی حس بصری شریانوں کے ذریعے ذہن تک پہنچائی جاتی ہے جہاں سے ہمارا شعور اس شے کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ بصارت کے عمل میں آخری اہم اور فعال عنصر ہماری خودی ہے اور مشاہدے کی اصل حقیقت خودی یا ذہنِ انسانی کا تصوّراتی عمل ہے۔ اس تصوّر کے بعض اجزاء مثلاً رنگ اور وضع قطع کی صفات میں بعض اجزاء ذہن انسانی کی فعالیت کے زیرِ اثر شامل کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ شے مدرک دراصل خارج میں موجود شے نہیں ہوتی بلکہ متعدد شئون پر مشتمل تصوّر ہوتا ہے۔ ذہن، بصری شریان اور روشنی کا کام اس پورے عمل میں معاون کا ہوتا ہے جس سے شعور کو اس تصوّر کی جملہ صفات کا علم ہوتا ہے۔ جب ایک شعور کو یہ علم حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ان واسطوں کے بغیر بھی اس تصوّر کو قائم کر سکتا ہے۔ شے کی صفات کا علم جتنا زیادہ اور واضح ہوگا بغیر حواس کا تصوّر بھی اتنا ہی زیادہ صاف اور واضح ہوگا۔

جب مسلسل اخلاقی پابندی اور مذہبی مراقبے سے ایک صاحبِ ایمان کی صحیح نصب العین کے لیے محبّت انتہائی بڑھ جاتی ہے اور خالقِ حقیقی کی صفاتِ عالیہ کا تصوّر بہت واضح ہو جاتا ہے تو بسا اوقات حالتِ مراقبہ میں اس پر ان صفات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے شعور پر پورے طور پر چھا جاتی ہیں۔ اس قلبی کیفیّت میں وہ اپنے خالقِ حقیقی کو بالکل اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح دنیا میں موجود کسی شے کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ روحانی تجربہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتا

اور بالخصوص ان لوگوں کے لیے اس کی تفہیم بہت مشکل ہوتی ہے جنہیں خود اس تجربے سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

ایک صاحبِ ایمان کی روحانی ترقّی کی اس منزل کو جس پر اسے عرفانِ حق حاصل ہوتا ہے، احسان کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی کا حوالہ ان الفاظ میں آیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

بے شک اللہ محسنین سے محبت کرتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احسان کی تعریف اس طرح کی ہے:

اَلْإِحْسَانُ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ (الحدیث)

احسان یہ ہے کہ تُو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تُو اُسے دیکھ رہا ہے۔

محبتِ خداوندی جتنی زیادہ گہری ہوتی ہے اسی قدر حقیقتِ مطلقہ کا مشاہدہ زیادہ واضح ہوتا ہے اور روحانی سرور بھی اسی تناسب سے حاصل ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں پہلے باری تعالیٰ کا بلاواسطہ مشاہدہ کرایا جائے تاکہ بعد میں وہ اس تعؐ پر ایمان لائیں حالانکہ یہ صرف حکم عدولی اور ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور اطاعت کی سخت مشقتوں سے گزر کر ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اسے حق تعؐ کا بلاواسطہ مشاہدہ حاصل ہو۔ چنانچہ انہیں اپنے نامعقول مطالبے کی سزا بھگتنی پڑی۔

خالقِ حقیقی کی اہم ترین صفت

خالقِ حقیقی مطلق خیر اور حسن ہے۔ محبّت اور رأفت و رحمت اس تعؐ کی بنیادی اور مرکزی صفت ہے۔ اس کی وہ تمام صفات بھی جن میں بظاہر ناپسندیدگی اور خفگی مثلاً غصّے، انتقام، تعذیب اور ہلاکت کا شمار ہوتا ہے، اس تعؐ کی صفتِ رحمت ہی کے مختلف مظاہر ہیں جو محبّت اور رحمت کے تحت مناسب مواقع پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ صفات بھی اصلاً خیر و حسن ہی کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قرآنِ حکیم میں سب سے اہم صفت رحمت بیان کی گئی ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط (الانعام: ۱۲)

اُس نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَیۡءٍؕ (الاعراف: ۱۵۶)

اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔

خالق حقیقی انسانِ کامل یعنی ایمانی تقاضوں کو پورا کرنے والی انسانی آبادی سے محبت کرتا ہے۔ یہ وہ نصب العینی انسانی سوسائٹی ہے جسے وہ دنیا میں تخلیق اور ارتقائی عمل کے نتیجے کے طور پر بنانا چاہتا ہے۔ انسانی اجتماع بتدریج ایک ارتقائی عمل میں سے گزرتے ہوتے اپنے بلند ترین ہدف تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ عمل مسلسل تخلیقی اور ارتقاء پذیر عمل ہے۔ اور خود خالق کائنات اپنی محبت و رحمت کا اظہار اس عمل کے ذریعے کر رہا ہے۔ اس کی صفتِ غضب بھی صفتِ رحمت کے تابع ہے۔ ذاتِ الٰہیہ کی وہ اہم فعلیت جسے ہم فطرت کی فعلیت کے طور پر جانتے ہیں، نہایت تعمیری، خلاقیت سے بھرپور اور ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ اس فعلیت میں مادی سطح، ذی حیات جانوروں کی سطح پر یا انسانی سطح پر جب کوئی چیز مانع ہوتی ہے اور اس کے ارتقائی عمل میں رکاوٹ بنتی ہے تو اسے سختی کے ساتھ علیحدہ کر دیا جاتا ہے تاکہ تخلیقی عمل کی ترقی بدستور جاری رہ سکے۔ ارتقاء کی راہ سے ان رکاوٹوں کے دُور کیے جانے میں اللہ تعالیٰ کے غیض و غضب اور انتقام کی صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ عذابِ استیصال، سماوی آفات و تکالیف اور قوموں کی سطح پر تباہی و بربادی اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ناپسندیدگی محبّت ہی کا ایک پہلو ہے

ناپسندیدگی محبّت اور چاہت ہی کا ایک پہلو ہے۔ جہاں کہیں محبّت کا جذبہ ہوتا ہے وہاں ناپسندیدگی کا جذبہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ جذبہ محبّت کو اپنے مخالف سے لازمی طور پر کد ہوتی ہے حسن کی ہر صفت کا ایک مخالف ہوتا ہے۔ اس مخالف یا ضد کے بغیر خود اسے مثبت طور پر جانا اور حقیقت کا روپ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ بُرائی، ظلم اور کذب سے نفرت کیے بغیر کوئی شخص اخلاقی فضیلت، انصاف اور حق سے محبّت نہیں کر سکتا۔ خالق حقیقی کو جب بعض صفاتِ حسنہ مثلاً محبّت سے متصف کیا جاتا ہے تو ہم ساتھ ہی اس کو اس کی مخالف اور متضاد صفات سے بھی متصف کرتے

ہیں۔ محبّت اپنی ضد سے شدید نفرت اور دشمنی کے بغیر سچّی محبّت نہیں ہوتی۔ تاہم اگرچہ مخاصمت اور ناپسندیدگی محبّت ہی کا جزو ہے، یہ محبّت کے اظہار کا منفی پہلو ہے۔ منفی پہلوؤں کا اظہار راہِ محبّت میں رکاوٹوں کے دُور کیے جانے کی صورت میں ہی ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ پوشیدہ رہتے ہیں۔ جُوں جُوں جذبۂ محبت پروان چڑھتا ہے اور اسی میں بالیدگی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ناپسندیدگی کا جذبہ اتنا ہی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جہاں اس کی ضرورت قطعاً نہیں رہتی۔

غضبِ خداوندی کے اظہار کے مواقع

خداوندی خفگی کی جملہ صورتیں انسانیت کی فلاح اور بہتری کے لیے اس دنیا میں اُس وقت ظہور پذیر ہوتی ہیں جب کچھ لوگوں کے اعتقادات اور عمل عمومی ارتقاء میں حائل ہوتے ہیں۔ اور ان کا مقصد ان بداعتقاد اور بدعمل لوگوں کی اصلاح اور خدائی نظم و عمل سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے بمطابق آیاتِ قرآنیہ:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ (السجدۃ: ۲۱)

اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے قریب کے عذاب کا مزہ بھی چکھاتے رہیں گے، شاید کہ یہ (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا۔ (النساء: ۱۴۷)

اگر تم (اللہ کی نعمتوں کا) شکر کرو اور (اس پر) ایمان رکھو تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا! اور اللہ تو قدر شناس (اور) جاننے والا ہے۔

فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا۔ (الانعام: ۴۳)

پھر جب ان پر ہماری (طرف سے) سختی آئی تو وہ کیوں نہیں گڑگڑاتے؟

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ۔ (التوبہ: ۱۲۶)

کیا یہ دیکھتے نہیں کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ پھر بھی نہ تو توبہ ہی کرتے ہیں اور نہ نصیحت ہی پکڑتے ہیں۔

اگر ہمارے نظریات اور عملی رویّے غلط ہوں اور خدائی سکیم کے ارتقاء میں حارج ہوں تو خالقِ حقیقی کی سزا ان میں بالقویٰ موجود ہوتی ہے۔ غلط سوچ اور بدعملی والے لوگوں کو جلد یا بدیر قوانینِ فطرت کے ہاتھوں اپنے کیے کی سزا مل کر رہتی ہے اور یوں انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر خدا کی سزا انہیں گھیر لیتی ہے۔ اگر وہ عذاب کے کوڑوں سے آنکھیں کھول لیتے ہیں اور عقیدے اور عمل کی اصلاح کر لیتے ہیں تو خالقِ حقیقی کی محبت اور انعامات کے مستحق بن جاتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (اٰل عمران : ۸۹)

مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور (اپنی) اصلاح کر لی تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

جب افراد اور قومیں اپنی اصلاح کر کے صحیح نصب العین کی طرف رجوع نہیں کرتیں اور اللہ کی طرف سے مہلت بھی ختم ہو جائے تو پھر انہیں مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ تاریخ میں بہت سی اقوام کی مکمل ہلاکت کا یہی سبب تھا۔ ان اقوام اور تہذیب کے باسیوں نے غلط نصب العین کے انتخاب اور بدعملیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو اللہ کے عذابِ استیصال کا مستحق بنا لیا تھا۔

اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ (یٰسٓ : ۳۱)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کر دیا تھا کہ اب وہ ان کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گی؟

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ (الانبیآء : ۹۵)

اور جس بستی (والوں) کو ہم نے ہلاک کر دیا اُن کے لیے (پلٹنا) محال ہے۔ وہ پلٹ نہیں سکیں گے۔

دنیا میں ان اقوام و ملل کے کھنڈرات اور نشانات اب بھی دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے عبرت کا سامان ہیں۔ اور ہر سوچنے اور غور کرنے والے ذہن کے لیے دعوتِ فکر ہیں کہ آخر ان کی تباہی و بربادی کا سبب کیا ہوا۔ اور وہ کیوں نسیاً منسیاً کر دیئے گئے۔ قرآن بصراحت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ان کی بربادی غلط نصب العین کو اختیار کرنے اور اعمالِ بد کی وجہ سے ہوئی:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ۔ (الروم: ۴۲)

(اے نبیؐ! اِن سے) کہہ دیجئے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ (تم سے) پہلے ہو گزرے ہیں اُن کا کیسا انجام ہوا ہے۔ اُن میں سے زیادہ تر مشرک ہی تھے۔

جس طرح ایک عقلمند باغبان درختوں کے ارد گرد سے اور پھولوں کی کیاریوں سے جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی اس لیے کرتا ہے کہ زمین، مٹی اور کھاد کی قوتِ مطلوبہ پودوں اور پھولوں کو ملے، اسی طرح خالقِ کائنات اس صفحہ ہستی سے باطل نظریات کی حامل قوموں کو ختم کر کے صحیح نصب العین کا انتخاب کرنے والے نیکوکاروں کے لیے جگہ بناتا ہے۔ اور انہیں زمین میں تمکن عطا کرتا ہے:

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۔ (ابراہیم: ۲۶)

اور کلمۂ خبیثہ (باطل نظریہ) کی مثال ایک خراب درخت کی سی ہے کہ زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس کو ذرا بھی قرار (و ثبات) نہیں۔

ہر قوم کو اصلاح کی مہلت دی جاتی ہے

خواہ کسی قوم یا تمدن کا نصب العین صحیح ہو یا غلط، اسے اپنی ذہنی، اخلاقی اور مادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور انہیں پروان چڑھانے کی پوری مہلت دی جاتی ہے۔ جب صورت یہ ہو کہ اس کی تمام تر صلاحیتیں مطلوبہ انسانی ارتقا میں منفی طور پر حائل ہوں تو پھر خالقِ کائنات کی طرف سے اس کے خاتمے کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے فطری نمو کی تمام صلاحیتیں ختم کر لینے کے بعد اس میں زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تنزل اور انحطاط کے درجہ بدرجہ مراحل سے گزرتے

ہوتے یہ قوم بالکلیہ صفحۂ ہستی سے ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی تہذیب لے لیتی ہے:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَآءِ وَهٰؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ (بنی اسرائیل: ۲۰)

(اے پیغمبرؐ) ہم اِن کو اور اُن کو سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے ہیں۔ اور تمہارے پروردگار کی بخشش (کسی سے) رُکی ہوئی نہیں۔

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ۔ (الاعراف: ۱۸۲)

ہم انہیں بتدریج (عذاب کی طرف) اس طرح گھیر لائیں گے کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی۔

ان آیاتِ قرآنیہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ کسی تہذیب کی موجودہ عظمت و بڑائی خواہ وہ کئی صدیوں پر محیط ہو، اس بات کی ضامن نہیں ہے کہ اس کی نظریاتی بنیادیں صحت و سلامتی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ۔ (ابراہیم: ۳۰)

(اے نبیؐ! اِن سے) کہہ دیجئے کہ (چند روز) عیش کر لو، پھر بالآخر تمہارا لوٹنا دوزخ ہی کی طرف ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (الحجر: ۸۸)

ہم نے اِن (کافروں) کی کئی جماعتوں کو جو (متاعِ دنیا سے) بہرہ مند کیا ہے تم اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو!

چنانچہ اگر کوئی تہذیب غلط نصب العین اور باطل نظریۂ حیات پر استوار ہے تو اسے جلد یا بدیر ختم ہی ہونا ہے۔ صرف اسی تہذیب اور قوم کی صلاحیتیں ہمیشہ قائم و دائم رہنے والی ہیں جس کے نظریات صحیح نصب العین یعنی خدائے برتر و بزرگ کے یقین پر مبنی ہیں۔ صرف انہی تہذیبوں میں ارتقاء کے ناقابل شمار اوصاف ہوتے ہیں۔ تمام باطل نظریات رکھنے والی تہذیبیں یکے بعد دیگرے اس مکمل اور ہمہ گیر عالمی تہذیب کے لیے جگہ بنانے کے لیے معدوم ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اور مضبوط اور شاخیں بلند و بالا اور تر و تازہ ہیں اور وہ سال بھر ثمر بار رہتا ہے:

مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا

ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ (ابراہیم: ۲۴-۲۵)

کلمۂ طیبہ (نظریۂ توحید) کی مثال ایسے ہے جیسے ایک اچھا درخت جس کی جڑ (زمین میں) جمی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر موسم میں پھل لاتا رہتا ہو۔

انسانی خودی کی تمام اچھی صفات، صفاتِ الٰہیہ کا پرتو ہیں

خدائے عزّ وجل کی اہم ترین صفت کی طرح انسانی خودی کی مرکزی اور اہم ترین صفت بھی محبّت اور رحیمیّت ہے۔ باقی تمام صفات صفتِ محبّت کے تحت آتی ہیں یا اس کے مختلف پہلو ہیں۔ چونکہ انسانی خودی کی تمام اچھی صفات کا منبع و سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہیں اسی لیے خدا کی صفتِ محبّت کی طرح انسانی سطح پر بھی اخلاقی فضائل اور محاسن میں صفتِ محبّت کو مرکزی حیثیّت حاصل ہے۔ اس طور انسان صفاتِ الٰہیہ ہی کا ایک بہت چھوٹے پیمانے پر عکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قولِ مبارک ہے:

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ۔

بے شک اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

اور یہی سبب ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اللہ کے نمائندے اور خلیفہ کی حیثیّت میں یہ اس کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ خدائی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے اور نہ صرف اپنی بلکہ پوری بنی نوعِ انسانی کی روحانی ترقی کے لیے بھرپور جدوجہد کرے اور کمال کے مطلوبہ نقطۂ عروج تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

خلافتِ ارضی کی صراحت مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں ملتی ہے:

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ (البقرۃ: ۳۰)

جب تمہارے رَب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں (اپنا) ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

انسان خلافتِ ارضی کے تقاضے پورے کر کے اپنی باطنی صلاحیتوں کو نہ صرف ظاہر

کرتا ہے بلکہ انہیں پورے طور پر ترقی کے مواقع بھی بہم پہنچاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ان تقاضوں کو پورا کرنا اس کے اپنے فائدے میں ہے۔ خلافتِ ارضی کے اخلاقی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل کو خالقِ کائنات نے اپنی نصرت و مدد سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور صلے کے طور پر نہ صرف روحانی و نفسیاتی بلکہ مادی انعامات کی وعید سنائی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ۔ (محمد: ۷)

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔

اللہ کی عنایات اور اس کے انعامات حقیقت یہ ہے کہ اس کائناتی ارتقائی عمل ہی کا حصہ ہیں جو خالقِ کائنات نے مقرر فرمایا ہے اور جو کوئی قوم اور اجتماعِ انسانی اس عمل کو اختیار کر کے اس کی تقویت کا باعث بنتا ہے وہ از خود ان سے متمتع ہوتا ہے۔ ان انعامات میں سے وہ اہم انعام جو باقی سب پر حاوی ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ قوم روئے ارضی پر تمکن اور غلبہ حاصل کرتی ہے اور مخالف نظریہ ہائے حیات پر فتح حاصل کر کے دنیا میں مستقل طور پر قائم رہتی ہے۔ اس حقیقت کا بیان مندرجہ ذیل دو آیاتِ قرآنیہ میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (المنٰفقون: ۸)

اور عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (آلِ عمران: ۱۳۹)

اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن (صادق) ہو۔

نفرت و مخالفت صرف صحیح محبت کے لیے روا ہے

نفرت و مخالفت صرف اس وقت جائز ہیں جب وہ صحیح محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہوں۔ چونکہ انسان کا اصل مقصد محبتِ الٰہی ہے، اس لیے جب اس کا جذبۂ عشق و محبت صحیح رُخ پر ہوتا ہے تو وہ ہر اس چیز سے محبت کرتا ہے جس سے اللہ محبت کرتا ہے، اور ہر اس چیز سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ نفرت کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس کائنات میں خالقِ حقیقی کے ساتھ شریکِ فاعل کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ ہر اس شخص سے جنگ کرتا ہے

جو خالقِ حقیقی کی مجوزہ سکیم میں باغیانہ روش رکھتا ہے۔ یہ باغی حسن، اچھائی اور حق کو پامال کرتے ہوئے اس راہ کو مسدود کرتا ہے جس پر چل کر قافلۂ انسانیت اپنی معراج حاصل کر سکتا ہے۔ حق و باطل کی اسی کشمکش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ:

مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ (رواہ مسلم)

تم میں سے جو کوئی بھی کسی بُرائی (کا ارتکاب ہوتے) دیکھے تو اسے اپنے زورِ بازو سے روک دے، اور اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے (اس کے خلاف آواز اٹھائے) اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنے دل سے (اسے بُرا سمجھے)۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ گناہ اور معصیت کو دیکھ کر ایک سلیم الفطرت اور مومن انسان کی حمیت جوش میں آتی ہے اور اس طرح خدا اپنے ان بندوں کے ذریعے باطل کی سرکوبی کا بندوبست کرتا ہے:

يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ (التوبہ: ۱۴)

اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں عذاب دے گا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ط (التوبہ: ۳۸)

اے اہلِ ایمان تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جنگ کے لیے) نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین پر گرے جاتے ہو۔

حق کے لیے کشمکش (جہاد)

حقیقی ایمان والے راست باز انسان کا لازمی شیوہ ہوتا ہے کہ وہ تمام طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے اور ان سے مسلسل کشمکش رکھتا ہے۔ اسلامی اصطلاحات میں اس کوشش اور کشمکش کو "جہاد" کہتے ہیں۔ موقع و محل کی مناسبت سے یہ کشمکش اور باطل کی مخالفت نسبتاً نرم رویے کے ساتھ اور تشدّد آمیز دونوں طرح سے ہو سکتی ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى

الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔ (الفتح : ۲۹)

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں ۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (مگر) آپس میں رحم دل ہیں ۔

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ (التوبہ : ۱۲۳)

اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں ۔

وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ (التوبہ : ۷۳)

اور ان کے مقابلے میں سختی کا رویّہ اختیار کرو ۔

وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (التوبہ : ۴۱)

اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو ۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ (التوبہ : ۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے بہشت (کی دائمی زندگی) ہو ۔

حق کے لیے حمیّت اور باطل سے نفرت مردِ مومن کی خاص صفت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس صفت کو اس کی دوسری صفات بالخصوص محبّت و رحمت سے کوئی بُعد نہیں ۔ بلکہ اوّل الذکر مؤخر الذکر ہی کا ایک پہلو ہے ۔ مردِ مومن خود ناگزیر حالات ہی میں مسلح تصادم کا آغاز کرتا ہے اور یہ مرحلہ اس وقت آتا ہے جب باطل کی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنا ازبس ضروری ہو جائے ۔ چنانچہ جب تک بالفعل حق کو عالمگیر غلبہ حاصل نہیں ہو جاتا ، کوئی نہ کوئی باطل نظریہ یا مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر انسانوں کو گمراہی کی راہ پر چلا کر اخلاقی و روحانی طور پر کمزور کرتا رہے گا ۔ حسن ازل کے پرستار اور محبّ باطل کے پھیلاؤ کو سختی سے روکتے ہیں ۔ جوں جوں دنیا حق کو اپناتی چلی جائے گی ، نیک اور مومن حضرات کی مخالفت اور نفرت بھی خود بخود کم ہوتی جائے گی ۔ خالقِ حقیقی سے محبّت و عشق کی لازمی شرط عمل اور سعی پیہم ہے ۔ اور یہ عمل اور جدوجہد اگر محدود پیمانے پر رہتا ہے اور اس کا دائرہ وسیع نہیں ہوتا تو اس کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوتے ۔ ایک عزمِ

مصمم اور جذبہ جہاد رکھنے والا مومن اپنی خودی کے مزید استحکام کے لیے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی بھرپور اور وسیع پیمانے پر کوشش کرتا ہے۔ اس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ نصب العین اور اس کا حصول اسے ہر دوسری چیز پر مقدم ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مشاغل اسی حوالے سے طے پاتے ہیں۔ اگر وہ جزوی طور پر کچھ دوسرے نصب العینوں کو بھی محبوب رکھتا ہے تو اس کے قلب و دماغ کی کچھ صلاحیتیں ان کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ صحیح نصب العین کا حق اس صورت میں کماحقہٗ پورا نہیں ہو سکتا۔ یعنی ایسے شخص کی وفاداریاں منقسم ہو کر خود اس کی ذہنی یکسوئی ختم کر دیتی ہیں۔

جبلّی خواہشات کی مناسب تسکین انسانی ارتقا میں ممد ہے

صحیح اور اعلیٰ ترین نصب العین کی خدمت ہی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک صاحبِ ایمان اپنی فطری خواہشات کی مناسب تسکین کے لیے تگ و دو کرے۔ ان فطری خواہشات کا تعلّق نہ صرف اس کی زندگی کے بقا سے ہے، بلکہ یہ اس میں اور ابنائے نوع میں خالقِ حقیقی اور نصب العین سے محبّت و عشق کی افزونی کے لیے بھی ضروری ہیں۔ لیکن چونکہ ان فطری جبلّی خواہشات کی تکمیل لذّت کا باعث بھی ہوتی ہے اور ان میں صحیح نصب العین کے تقاضوں سے بالعموم تصادم کا رجحان بھی ہوتا ہے، اس لیے ایک صاحبِ ایمان شخص کو ان اندھی اور بگ ٹٹ خواہشات کو ایک مناسب حد تک پورا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ماہِ رمضان کے روزے اسی قسم کی تربیت کے سلسلے میں اہمیّت رکھتے ہیں۔ ایک ماہ کے دوران روزے انسان کو اپنی خواہشات اور جبلّی تقاضوں کو کنٹرول میں رکھنے کی زبردست مشق فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ اپنی جگہ کوئی بھی جبلّی خواہش غلط یا بے مقصد نہیں ہے۔ اس لیے ان کو مکمّل طور پر اور مستقلاً دبانا قطعاً نامناسب ہے۔ ہر جبلّی خواہش کا بقائے انسانی اور عمومی ارتقاء میں اہم کردار ہوتا ہے اور صرف صحیح نصب العین کا تصوّر ہی ان کی جائز حدود کا تعیّن کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دنیا سے قطع تعلّق، شادی بیاہ نہ کرنا اور عائلی زندگی سے اجتناب اور دوسری سماجی مشغولیتوں سے کنارہ کشی کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ جیسا کہ درج ذیل حکم سے معلوم ہوتا

ہے اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔

اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ عیسائی راہبوں نے نفس کُشی کے جو طریقے اور رہبانیت کی جو روش اختیار کی، وہ ان کی اپنی ایجاد تھی۔ ان کے نبی نے انہیں اس کی تعلیم نہیں دی تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر عبادت اور زہد و تقویٰ میں غلو کرتے ہوئے اس بدعت کو شروع کیا:

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (الحدید: ۲۷)

اور رہبانیت کی تو انہوں نے خود ایک نئی بات نکال لی، ہم نے اسے ان پر واجب نہیں کیا تھا۔

فطری خواہشات، تقاضے اور جبلّتیں خالقِ حقیقی کے نظمِ تخلیق کا اہم حصّہ ہیں اور ان کا مقصد انسانی بقاء و ارتقاء میں مدد ہے۔ چنانچہ جبلّتوں کا پُورا کرنا خالقِ حقیقی کے پروگرام میں معاونت کے مترادف ہے اور ان کی تردید یا مخالفت خدا کے عملِ تخلیق اور ارتقاء کی مخالفت۔ جملہ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد یہ نہیں رہا کہ وہ انسانوں کو اپنی فطری اور جبلّی خواہشات کو کچلنا اور دبانا سکھائیں، بلکہ ان کا مقصدِ بعثت انسانوں کی جبلّی خواہشات اور فطری تقاضوں کی تسکین کو صحیح نصب العین کی حدود میں مقید کرنا تھا۔ تاکہ وہ نصب العین کو نقصان کی بجائے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر پُورا کریں اور اس کے حصُول میں ممدّ ہوں۔ جبلّی قوتوں کا صحیح اور جائز استعمال نہ صرف مستحسن ہے، انسانی معاشرے کی ترقی اور نمو میں یہ انتہائی مثبت اہمیّت کی حامل ہیں۔

عائلی زندگی کی اہمیّت اور اعزہ و اقارب کے حقوق

جبلّی تقاضوں میں سے جنسی جذبہ اسلام میں مناکحت کی شکل میں بھرپور تسکین حاصل کر سکتا ہے۔ نکاح سے ایک مرد دوسروں سے کئی رشتے اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً وہ بیٹا، بھائی، داماد، شوہر، باپ، چچا، سسر وغیرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت، بیٹی، بہن، بہو، بیوی، ماں، خالہ یا

چچی، خوشدامن وغیرہ ہوتی ہے۔ ان تمام رشتوں کے اعتبار سے ہر مرد اور عورت کے صحیح نصب العین کے ضمن میں متعدد حقوق وفرائض ہوتے ہیں۔ بالخصوص فرائض کی بجاآوری ایمان کے تقاضوں میں سے اہم فرض ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک مومن کو کوئی بھی اچھا اور نیکی کا کام اپنے قریب ترین عزیز واقارب سے شروع کرنا چاہیے۔ جو بھی خونی طور پر زیادہ قریب ہے اس کا حق بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ تاہم یہ خیال رہنا چاہیے کہ ایک ہی درجے کے قرابت داروں کے درمیان کوئی فرق وتفاوت نہ ہو اور اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ چنانچہ دین نے اس معاملے میں بھی فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ چونکہ انسان طبعاً اپنے قریب ترین خونی رشتہ داروں سے زیادہ محبّت کرتا ہے، اسی لیے اسلام نے انہی کے حقوق بھی زیادہ رکھے ہیں۔ ایک سلیم الفطرت اور نیک انسان کا دائرۂ خیر قریبی عزیزوں سے بڑھ کر پوری انسانیت کو محیط ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ایثار اور قربانی کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کرتا ہے۔ ہمارے دین کی تعلیمات میں قرابت داروں کے حقوق کے بارے میں بڑی تاکید ملتی ہے۔ چنانچہ قریبی رشتہ داروں اور اہلِ خانہ سے محبّت اور اچھے سلوک کی تعلیم پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے متعدد اقوال میں دی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

اِبْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ (بخاری)

(خرچ کرنے میں) اُن سے ابتدا کرو جو تمہارے زیرِ کفالت ہیں۔

اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی خونی رشتے جب حق اور انصاف کے تقاضوں سے متصادم ہوں تو ان کی کوئی اہمیّت باقی نہیں رہتی۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں نے دینِ حق کے سلسلے میں کسی کی پرواہ نہیں کی۔ قریب ترین اور محبوب ترین عزیزوں کی محبّت بھی دینی تقاضوں کے تابع رہی۔ دین کا غلبہ اور صحیح نصب العین سے سچّی محبّت کا اظہار اس کے بغیر ممکن بھی نہ تھا۔

ریاست: طبعی انسانی فعلیّت کا اہم گوشہ

انسانی تگ ودو اور فعلیّت کے ایک اہم گوشے کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ انسانی فرد اپنی جبلّت اور نصبُ العین یا آدرش کے حصول کے لیے اپنے آپ کو ایک منضبط معاشرے

کی شکل میں رہنے پر مجبور پاتا ہے۔ بحیثیت حیوان وہ جبلّی طور پر دوسرے انسانوں کے ساتھ اجتماعی طور پر بود و باش رکھنے کا زبردست داعیہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عاقل انسان ہونے کی وجہ سے وہ بالخصوص ایسے افراد کی معیّت چاہتا ہے جو اس کا ہی نصب العین عزیز رکھتے ہوں اور اس کے حصول میں کوشاں ہوں۔ وہ اپنے اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے جبلّی رُجحان کی اس طور زیادہ بہتر آسُودگی حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی نصب العین کی محبّت ان افراد کے درمیان جذبۂ اخوت پیدا کرکے ان کو ایک اجتماع اور ایک ریاست بنانے پر اکساتا ہے۔

ایک ریاست کے افراد اپنے نصب العین سے جتنا زیادہ پیار کرتے ہیں، وہ اتنا ہی ایک دُوسرے سے محبّت کرتے ہیں اور ان کے مابین مساوات، اخوّت اور باہمی اُلفت کے جذبات بھی اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔ ان کی باہمی محبت جتنی زیادہ ہوتی ہے، ریاست کا داخلی استحکام، نظم اور قوت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ مسلمان معاشرے کے تمام افراد ایک جیسی عزت کے لائق اور صاحب شرف شمار ہوتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ سب نیک اور خدا ترس ہوں۔ اسلام نہ اشراف کو حکومت کی اجازت دیتا ہے، اور نہ ہی اس میں کسی خاص طبقے کو خصوصی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح اسلام میں نہ مذہبی پیشوائیت کا کوئی تصوّر ہے اور نہ ہی یہ ذات پات کا قائل ہے۔ کوئی شخص رنگ، زبان، نسل، ذات، علاقے یا سماجی رُتبے کی بنا پر دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا۔ صرف وہی ریاست جس کی بنیاد صحیح نصب العین کے تصوّر پر رکھی گئی ہو، ایک فرد کی طرح مربُوط اور منظم انداز میں برسرِ کار رہ سکتی ہے۔ ایسی ریاست ایک ہی وقت میں ڈکٹیٹرشپ اور جمہوریّت کے تمام محاسن اپنے اندر رکھتی ہے۔ بلاشبہ کسی بھی نصب العینی معاشرے یا گروپ کے افراد ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہیں، لیکن صرف ایسے گروپ کے افراد جو صحیح نصب العین سے محبّت رکھتا ہے، باہمی محبت کے ممکن الحصُول اعلیٰ ترین معیار تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ صحیح نصب العین کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ کوئی بھی فرد تحفّظات اور لاشعوری ناہمواریوں کے بغیر اس سے بھرپُور طریقے سے محبت کر سکتا ہے، اور یہ کہ یہ محبت اس کے حیوانی و سفلی جذبات کو اس حد تک کنٹرول کر لیتی ہے کہ وہ قطعاً غیر مؤثر ہو جاتے ہیں اور اس کی ذہنی و رُوحانی بالیدگی میں بالکل مزاحم نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے افراد کا باہمی اتحاد اتنا کامل ہو

جاتا ہے کہ کسی ایک فرد کی تکلیف تمام دوسروں کو محسوس ہوتی ہے۔ گویا پورا معاشرہ یا اجتماع ایک فردِ واحد کی طرح ہو جاتا ہے اور مختلف افراد کی حیثیت اس فردِ واحد کے اعضاء و جوارح کی سی ہو جاتی ہے۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم مومنینِ صادقین کی اجتماعیّت کی کیفیت ان الفاظِ مبارکہ میں بیان کرتے ہیں:

تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَکٰی عُضْوٌ تَدَاعٰی لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰی۔

"تم مومنوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی، محبت اور ہمدردی میں باہم ایک جسم کے مانند پاؤ گے۔ جب (اس کے) ایک عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو باقی سارا جسم اس کی خاطر بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

اَلْمُؤْمِنُوْنَ کَرَجُلٍ وَاحِدٍ اِذَا اشْتَکٰی عَیْنُهٗ اِشْتَکٰی کُلُّهٗ وَاِنِ اشْتَکٰی رَأْسُهٗ اِشْتَکٰی کُلُّهٗ۔

"اہلِ ایمان ایک فردِ واحد کی مانند ہیں کہ جب اس کی آنکھ میں تکلیف ہو تو وہ سب کا سب تکلیف میں ہوتا ہے۔ اور (اسی طرح) اگر اس کے سر میں تکلیف ہو تو وہ پورے کا پورا تکلیف میں ہوتا ہے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس اجتماعیّت اور ریاست کی حقیقت کھول کر بیان کرتے ہیں جس کی بنیاد صحیح نصب العین سے وفاداری اور محبّت پر رکھی گئی ہو۔ اور اگر قدرے غور و تامّل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس ریاست میں مکمل جمہوریّت اور مکمل آمریّت کے تمام محاسن بیک وقت جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک صحیح نصب العینی ریاست سے افراد کے ربط و تعلق کو علم الحیات کے ماہرین کی رائے میں صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک نامیاتی وجود در اصل ان گنت انفرادی خلیوں کے انتہائی مربوط وظائف پر انحصار رکھتا ہے۔ یہ لاتعداد خلیے نہ صرف باہم دگر مربوط ہوتے ہیں، بلکہ من حیث المجموع پورے نامیاتی وجود کی بقاء، ترقی اور نشو و نما کا باعث بنتے ہیں۔ ہر نامیاتی وجود انہی خلیوں اور ان کی فعلیت کا مرہونِ

منّت ہے۔ ہر انفرادی خلیہ اپنی جگہ ایک مکمّل اور آزاد نامیاتی وجود ہے جو خوراک لے کر نہ صرف زندہ رہتا ہے بلکہ اپنا مخصوص فعل بھی انجام دیتا ہے اور نمو پذیری کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ بصورتِ دیگر خوراک نہ ملنے کی صورت میں مضمحل ہو کر رفتہ رفتہ مکمل طور پر مردہ ہو جاتا ہے۔ ہر خلیہ کلی نامیاتی وجود کی بقا کے لیے اپنا مخصوص وظیفہ انجام دیتا ہے اور بذاتِ خود دماغ یا مرکزی اعصابی نظام میں مرتکز حیاتی قوت سے انضباط پاتا ہے۔ چنانچہ ایک زندہ اور صحت مند فرد لاتعداد خلیوں کے وظائف اور مکمل باہمی ہم آہنگی کے باعث چلتا پھرتا اور عمل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ تمام خلیے ایک وحدت کے طور پر کام کر کے ہی کسی فرد کے وجود کو ممکن بناتے ہیں۔ ایک نصب العینی معاشرے میں افراد کی حیثیت اور تعلق نامیاتی وجود میں خلیوں کی حیثیت اور تعلّق جیسی ہے۔ ایسے معاشرے میں افراد باہم دگر مضبوط اور گہری محبت کے رشتوں میں جکڑے ہوتے ہیں اور ان کی یہ باہمی محبت ایک آدرش اور نصب العین سے محبّت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے فرد کی مثال شہد کی مکھیوں کے چھتّے کی طرح ہے جہاں تمام مکھیاں اپنی ملکہ کی حفاظت اور عزّت و تکریم کے ساتھ ساتھ دیگر بے شمار کام انجام دیتی ہیں۔ آئیڈیل اسلامی ریاست جمہوریت اور آمریت کا مجموعہ ہوتی ہے جسے شہد کی مکھیوں کے چھتے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ جس طرح یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا مکھیوں کے چھتے میں نظام آمریت کا ہے یا جمہوریت کا، اسی طرح اسلامی اور صحیح نصب العینی ریاست کا معاملہ ہے۔ چھتے میں کوئی ایک مکھی اپنے لیڈر کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی، بلکہ اسے اس کی مکمل اطاعت کرنا ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک آمریت کا نظام ہے۔ لیکن چونکہ ہر فرد کا عمل پوری اجتماعیت کے مفاد کے لیے اور دوسرے افراد سے مکمل مطابقت رکھتا ہے، یہ ایک طرح کا جمہوری نظام بھی ہے۔ اور یہ جمہوری نظام قائم اس لیے رہتا ہے کہ لیڈر کا جو خیال ہو، چھتے کی ہر مکھی کا بھی وہی خیال ہوتا ہے۔ مکھیوں کے چھتے اور ایک اسلامی ریاست میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر میں مکھیاں مکمل ڈسپلن اور ہم آہنگی کا اظہار غیر شعوری اور جبلی طور پر کرتی ہیں، جبکہ نصب العینی اسلامی ریاست میں افراد یہی ہم آہنگی شعوری اور آزادانہ طور پر حاصل کرتے ہیں اور یہ ممکن صرف اسی لیے ہوتا ہے کہ انہیں اپنے نصب العین اور اہداف سے عشق کی حد تک پیار ہوتا ہے اور وہ اس ضمن میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ اور عقل کو استعمال کرتے ہوئے مسلسل عمل کرتے ہیں۔ ایک اسلامی ریاست کے مسلمان

شہری اجتماعی ترقی اور استحکام کے لیے کامل تنظیم اور اتحاد کے ساتھ عمل کرتے ہیں اور ان کا باہمی اخوت کا جذبہ کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔

صحیح و راست نصب العین سے محبت کی نوعیت

صحیح اور راست نصب العین کا محبّ عموماً اعلیٰ عقلی و علمی صلاحیتوں سے نوازا جاتا ہے اور وہ اس بات کا علم بھی رکھتا ہے کہ وہ اپنے ربّ کی عبادت کے تقاضے بتمام و کمال کیونکر پورے کر سکتا ہے اور اپنی محبت اور تعلقِ خاطر کو کس طرح واقعی و عملی شکل دے سکتا ہے۔ نصب العین سے مطلوب محبت کو اندھے بہرے جذبے اور لاابالی پن سے کسی درجے میں بھی مناسبت نہیں ہے۔ بلکہ یہ نصب العین کے حوالے سے بلند ترین یا ادنیٰ معروف اخلاقی محاسن و صفات سے عبارت ہے۔ نصب العین خود جتنا بلند اور ارفع ہوگا، اس سے محبّت اور تعلق خاطر میں اسی تناسب سے اعلیٰ اخلاقی صفات کی جھلک پائی جائے گی۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہے کہ ان اخلاقی صفات کے اظہار میں عقل و فکر کی صلاحیتیں اور علمی درجہ ممد ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نصب العین کی اہمیّت اس اعتبار سے بہت ہوتی ہے کہ اس سے کی جانے والی محبّت اور اس میں مستعمل عقل و فہم کا دار و مدار خود اس نصب العین پر ہوتا ہے۔ کسی فرد کا زندگی کے بارے میں عمومی رویہ اس کے نصب العین کے حوالے ہی سے ترتیب پاتا ہے۔ جوں جوں اس کے نصب العین کا معیار بلند تر ہوتا ہے، اس نصب العین میں مضمر فہم و فراست کا معیار بھی بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ صرف صحیح و راست نصب العین سے محبت میں مضمر عقل و فہم ہی حقیقی اور واقعی ہیں اور اس نصب العین سے محبت میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے عقل و دانش اور فہم و فراست کے امکانات اسی قدر زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ اگر کسی فرد کا ہدف پست رہے تو اس میں فہم و فراست کی نمو بھی اسی درجے میں پست رہتی ہے۔

اسلامی ریاست کا مقصدِ وحید

اسلامی ریاست کا صرف اور صرف ایک مقصد ہے اور وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں

پر نصب العین سے محبت میں اضافہ اور خود شعوری میں افزونی ہے۔ تاہم جیسا کہ قبل ازیں کہا جا چکا ہے نصب العینی محبت اور خود شعوری کوئی علیٰحدہ اور داخلی ذہنی کیفیات یا اعمال کا نام نہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ محبت کے استحکام اور داخلی نظم کا تعلق بہت سے عوامل سے ہے اور ان عوامل میں عملی اظہار کے ساتھ ساتھ خارجی، مادّی اور سماجی عناصر کا عمل دخل نمایاں ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کے مندرجہ بالا مقصدِ اعلیٰ سے اس ریاست کے دو اہم ترین وظائف خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔ اسلامی ریاست کو اپنے مقصدِ وحید (جو خود پوری تخلیق کا مقصد بھی ہے) کے حصول کے لیے درج ذیل دو اہم ذمّہ داریوں کو پورا کرنا ہوتا ہے:

اوّلاً: اسے وہ تمام ضروریات پورا کرنا ہوتی ہیں جو انسان کے حیاتیاتی وجود کے لیے ازبس ضروری ہیں۔ اگر اس کا وجود برقرار رہے، تو تبھی یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ حقائق کا زیادہ سے زیادہ شعور حاصل کر سکے۔ ان بنیادی ضروریات میں خوراک، گھر، لباس اور بیماری کے تدارک کے وسائل شامل ہیں۔ اگر خود نصب العین سے محبت اس بات کا تقاضا کرے کہ انسان اس کی خاطر اپنی جان قربان کر دے، تو بات دوسری ہے۔ اور ایک اعتبار سے ہر انسان کو ایسے وقت کی تمنّا کرنی چاہیئے لیکن عام حالات میں ہر انسان کو روحانی و اخلاقی ترفّع کے حصول کے لیے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا قولِ مبارک ہے:

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا

"تنگ دستی تو بس کفر ہوا ہی چاہتی ہے!"

ثانیاً: اسلامی ریاست کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ ایسے حالات اور ماحول پیدا کرے جس میں فرد اپنے نظریاتی وجود کو قائم رکھ سکے۔ چنانچہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا نظامِ تعلیم رائج کرے جس میں فرد اپنے اعلیٰ ترین نصب العین کا نہ صرف شعور حاصل کر سکے بلکہ اسے وہ ذرائع بھی معلوم ہوں جن پر عمل کر کے وہ نصب العین اور حسنِ ازلی کو پا سکتا ہے۔ اس نظامِ تعلیم میں اس بات کا اہتمام بھی ہونا چاہیے کہ طالب علموں کو غلط اور گمراہ کن نظریات کے منفی اثرات سے بچایا جائے۔ فی الجملہ نظامِ تعلیم ایسا ہونا چاہیے جس سے فرد میں احساسِ ذات اجاگر ہو اور اعلیٰ ترین اقدار کے حصول کے لیے جذبے کو مہمیز ملے۔

پہلے فریضے کی تکمیل اسلامی ریاست ملک میں تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کو مضبوط اور صحت مند بنیادوں پر ترقی دے کر کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ 'بیت مال المسلمین' قائم کرتی ہے تاکہ مستحق اور کم وسائل والے لوگوں کو قرضہ حسنہ یا مالی تعاون کسی دوسری شکل میں دیا جا سکے۔ صرف اسی صورت میں ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے کاروبار کو مستحکم کر کے ملکی معیشت کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اس بیت المال سے رقوم غربا، مساکین اور بوڑھے لوگوں کی فلاح و بہبود پر بھی خرچ کی جائیں گی۔ اسی ضمن میں اسلامی ریاست زکوٰۃ کی وصولی کا اہتمام بھی کرے گی۔ زکوٰۃ کا قانون اور شرح ادائیگی ہر مسلمان پر واضح ہے۔ اسلامی ریاست کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام صاحبِ نصاب لوگوں سے زکوٰۃ لے کر بیت المال میں جمع کرے۔ اور ان رقوم کو ریاستی فلاح و بہبود کے کاموں اور دوسری تمام جائز مدات میں خرچ کرے۔

اسلامی ریاست کا دوسرا فریضہ ایک لحاظ سے اہم تر اور اعلیٰ تر فریضہ ہے، اور وہ یہ تعلیم اور ابلاغ کے تمام ذرائع پر مکمل کنٹرول کے ذریعے پورا کرتی ہے۔ وہ ہر سطح پر یعنی یونیورسٹی، کالج، سکول اور مسجد میں ایسی تعلیم کا انتظام کرتی ہے جس سے لوگوں میں خداشناسی، خداترسی اور اسلام سے محبّت کے جذبات پروان چڑھیں۔ وہ پریس، ریڈیو، ٹیلیویژن، فلم اور دوسرے تمام ذرائع ابلاغ پر کڑی نظر رکھتی ہے اور ان سے غیر اسلامی نظریات و افکار کی ترویج پر پابندی لگاتی ہے — ان پابندیوں کے ساتھ مثبت طور پر وہ ان تمام ذرائع و وسائل کو اسلامی نظریۂ حیات کی اشاعت کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اسلامی ریاست چونکہ بنیادی طور پر نظریاتی ریاست ہے، اس لیے اوّل الذکر فریضہ سے بڑھ کر وہ اس دوسرے فریضے کے تقاضے پورے کرتی ہے۔ وہ امکانی حد تک ایسے سازگار حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے جن میں لوگوں کی اپنے نصب العین سے وابستگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا جذبہ پروان چڑھے اور ایسے تمام ذرائع ابلاغ اور تعلیمی نظریات پر مکمل پابندی لگاتی ہے جو الحاد اور باطل نظریات کی ترویج کا باعث بنتے ہیں۔

اسلامی ریاست کی حفاظت و صیانت

اسلامی ریاست کی نظریاتی حدود کی حفاظت کے لیے سطور بالا میں جس نظام تعلیم کو اہم قرار

دیا گیا ہے اس کے دو پہلو ہیں : خارجی یا عمومی تعلیم اور داخلی یا خصوصی تعلیم۔ تعلیم کے خارجی پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ عالمی سطح پر اقوامِ عالم میں اسلامی ریاست کا فریضہ اپنے نظریۂ حیات کا نہ صرف تحفّظ اور مدافعت ہے، بلکہ عقلی، علمی اور اخلاقی طور پر اس کو برتر ثابت کیا جانا ہے۔ جدید ریاستوں کے وظائف میں اس وظیفے کو انتہائی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے اور اسے مختلف نام دیئے جاتے ہیں مثلاً پبلسٹی، تعلقاتِ عامّہ یا اطلاعاتی خدمات۔ اسلام میں ان تمام کا ایک ہی نام ہے اور وہ ہے "تبلیغ" یعنی ابلاغِ عامہ اور نشر و اشاعت۔ دوسری تمام ریاستوں کی طرح اسلامی ریاست بھی اس ضمن میں کتابوں، فلم، پریس، ریڈیو کو استعمال کرتی ہے اور ان تمام کو مواد فراہم کرنے کے لیے نظریاتی تحقیق و پلاننگ کے انتہائی منظم اور اعلیٰ علمی اداروں کی خدمات کا انتظام کرتی ہے۔ اگرچہ ایک اعتبار سے ان تمام ذرائع ابلاغ پر اس طرح کنٹرول کا نتیجہ اکثر و بیشتر مدافعانہ ہوتا ہے یعنی وہ اپنے ریاستی نصب العین اور نظریۂ حیات کا دفاع کرتے ہیں، لیکن اس داخلی استحکام کا بالواسطہ نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اسلامی ریاست کا نظریہ اقوامِ عالم کی برادری میں وقیع سمجھا جانے لگتا ہے اور باہر کی دنیا میں اس سے وابستگی کا حلقہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یا کم از کم لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اسے قابلِ اعتناء سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ اس پبلسٹی کی حیثیت باہر کے ممالک پر ایک نظریاتی اقدام یا حملے کی ہو جاتی ہے اور پُر امن انداز میں اسلامی ریاست کی جغرافیائی حدود میں وسعت کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اور کیا عجب کہ اسی "تبلیغ" اور نشر و اشاعت کے نتیجے میں پوری انسانیت اسلام کا انتہائی سائنٹفک اور علمی نظریۂ حیات قبول کر کے ایک وحدت کی شکل اختیار کرے، اور پوری دنیا اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو جائے۔

اسلامی ریاست کی توسیع

سائنسدان اب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آئندہ ایٹم یا ہائیڈروجن بموں کا استعمال پوری انسانیت کی تباہی پر منتج ہوگا۔ لیکن تباہی کے سلسلے میں سائنسدانوں کے پیش نظر صرف مہلک ہتھیار یا بم ہی ہوتے ہیں، اور ایک دوسری قوت پر ان کا دھیان بالکل نہیں جاتا۔ اس دوسری قوت کا تعلق نظریات کی قوت سے ہے جس کے مظاہر ہم اپنی آنکھوں سے آج کی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں

واقعہ یہ ہے کہ نظریات ہتھیاروں سے بھی زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ یہ ہتھیاروں سے زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں انہیں کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مہذّب اقوامِ عالم کا نظریات کی قوّت کے بارے میں احساس روز بروز بڑھ رہا ہے اور اب وہ جانتی ہیں کہ حربی آلات اور ہتھیاروں کو استعمال کیے بغیر دوسری قوموں کو فکری و نظریاتی قوّت سے مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ جس ریاست کا نظریۂ حیات جتنا زیادہ وسیع اور علمی بنیادوں پر استوار ہے، اتنا ہی اس بات کا امکان ہے کہ وہ دوسری ریاستوں پر نظریاتی طور پر اپنا تسلّط قائم کر لے۔ نظریۂ حیات کے باطل یا بودا ہونے کی صورت میں صرف ہتھیاروں کی برتری کسی ریاست کا تسلّط اور اقتدار قائم نہیں کر سکتی۔ کسی ریاست کا نصب العین اور نظریۂ حیاتِ انسانی اور فطرتِ انسانی کے بارے میں نظریات پر استوار ہوتا ہے۔ چنانچہ صرف وہی نظریہ جو انسان اور انسانی فطرت کے بارے میں صحیح اور سائنٹیفک علم پر مبنی ہے مستقبل کی دنیا میں کامیابی کے امکانات رکھتا ہے اور بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایسا نظریہ صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔ اسلامی ریاست اپنے صحیح نظریے کی بنا پر توسیع کے بے حد امکانات رکھتی ہے۔ اسلامی ریاست کے لیے عموماً حربی آلات اور سامانِ جنگ کو استعمال کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ اگرچہ وہ ان کی تیاری میں غفلت سے کام نہ لے گی کیونکہ اسے معلوم ہے کہ بعض حالات میں جنگ کے سوا چارا بھی نہیں رہتا لیکن انسانی نفسیات کے میدان میں انسان کا علم جوں جوں بڑھ رہا ہے، اہلِ اسلام کو توقع ہے کہ اسلام کی حقانیت اور زیادہ نکھر کر سامنے آئے گی اور انسان کا بالعموم اسلام کی صداقت پر ایمان بڑھتا چلا جائے گا۔ انسانی ارتقاء یا بالفاظِ دیگر تاریخ کا ارتقاء یہ بتاتا ہے کہ انسانیت کا سفر خود اپنی فطرتِ سلیمہ کو جاننے کا ایک طویل اور جاں گسل سفر ہے اور اس سفر کا اختتام ایک عالمگیر نظریۂ حیات کی دریافت پر ہوگا۔ اور یہ بات طے شدہ ہے کہ اس عالمگیر نظریۂ حیات کی بنیاد انسانی فطرت کا وہ صحیح علم بنے گا جو ہمیں صرف اسلام عطا کرتا ہے۔ چنانچہ بالآخر اسلام کی حقانیت مبرہن ہوگی اور اس کا عالمگیر غلبہ حقیقت بن کر سامنے آئے گا۔

اسلامی ریاست اور آزادئ فرد کا تحفّظ

سطور بالا میں وضاحت کے مطابق چونکہ صرف ایک اسلامی ریاست ہی فرد میں صحیح

نصب العین سے محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اس میں افزونی کی ضمانت دے سکتی ہے، اس لیے اسی تناسب سے وہ فرد کی آزادی اور اس کے زیادہ سے زیادہ ذہنی و روحانی ترفّع کا اہتمام کرتی ہے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کی صحیح نصب العین سے محبت کو جبراً اور زبردستی پروان نہیں چڑھایا جاسکتا۔ اسلامی ریاست کی مشینری ہر ممکنہ کوشش سے ایک مسلمان فرد میں صحیح نصب العین سے تعلق خاطر اور حبّ الٰہی میں بالیدگی کا باعث بنتی ہے۔ اور جوں جوں وہ اس میں کامیاب ہوتی ہے، فرد میں اپنی ذمہ داری اور آزادی کا احساس اسی قدر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف غلط اور ناپسندیدہ نصب العین سے تعلق کا باعث فرد پر کوئی نہ کوئی قدغن بنتی ہے، یعنی فرد پر داخلی یا خارجی دباؤ اور تحدیدات سے اس میں غلط اہداف سے محبت و تعلق نہ صرف پیدا ہوتا ہے بلکہ اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا ہے۔

خلیے اور نامیاتی وجود کا ربط و تعلّق

اگر ہم پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے بارے میں تشبیہ پر غور کریں تو ہم پر ایک فرد اور اجتماعی نظم یعنی ریاست کے مابین ربط و تعلق سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ آپؐ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کی مثال ایک فرد واحد کی کیفیت سے دی ہے۔ وہ جوشِ حیات جو ایک نامیاتی وجود کو زندہ اور برقرار رکھتا ہے، دماغ اور مرکزی عصبی نظام کے ذریعے پورے جسم تک پہنچتا ہے اور جسم کے ہر خلیے کو توانائی بہم پہنچاتا ہے۔ مجموعی طور پر جسم کی صحت و قوّت کا انحصار اسی جوشِ حیات پر ہوتا ہے۔ جب کسی نامیاتی وجود کا ایک خلیہ مطلوبہ حد تک توانائی حاصل کر لیتا ہے تو مرکزی عصبی نظام کے ذریعے وہ زائد توانائی دوسرے خلیوں کو منتقل کر دیتا ہے۔ گویا اس طرح ایک خلیہ اپنی 'زکوٰۃ' ادا کرتا ہے۔ ایک خلیہ دوسرے خلیوں کو توانائی دے کر پورے جسم کی قوّت و صحت کا باعث بنتا ہے اور مضبوط و توانا جسم دوبارہ انفرادی طور پر ہر خلیے کی مزید قوّت کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ خلیے اور جسم کے درمیان دوطرفہ ربط و تعلق ہے: خلیہ نہ صرف جسم کو قوّت دیتا ہے، اس سے لیتا بھی ہے۔ اسی طرح جسم خلیے کو توانائی دیتا بھی ہے اور اس سے لیتا بھی ہے۔

ریاست اور فرد کا باہمی تعلق

اُوپر دی گئی مثال سے ایک فرد اور اجتماعیت کا باہمی تعلق بھی بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح حیاتیاتی سطح پر جوشِ حیات ایک نامیاتی جسم کو نہ صرف وجود میں لاتا ہے بلکہ اسے برقرار بھی رکھتا ہے، اسی طرح نفسیاتی سطح پر وہ ایک اجتماعیت، منظم سوسائٹی اور ریاست کو وجود بخشتا اور اس کے تسلسل کا باعث بنتا ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں اس کی کیفیت نصب العین سے محبّت کی ہوتی ہے۔ وہ ریاست جو اپنے شہریوں میں نصب العین سے محبّت زیادہ سے زیادہ درجے میں پیدا کرتی ہے، خود بھی اسی تناسب سے مضبوط اور صحت مند بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ریاست میں حکومت کو وہی اہمیّت حاصل ہوتی ہے جو جاندار جسم میں دماغ اور عصبی نظام کی ہوتی ہے۔ جس طرح اس میں دماغ مرکزِ حیات کی حیثیّت رکھتا ہے، اسی طرح حکومت کسی ریاست میں محبّت و وابستگی کا مرکز ہوتی ہے اور حکومت کی تشکیل اس اجتماعیت میں نصب العین سے سب سے زیادہ عشق و محبّت رکھنے والے لوگ کرتے ہیں۔ جس طرح ایک جاندار وجود کے ذہن سے خون کی شریانوں کے ذریعے جوشِ حیات جسم کے تمام حصّوں میں پہنچتا ہے تاکہ وہ زندہ و قائم رہے اسی طرح ریاست کی لیڈر شپ میں موجود نصب العینی محبّت نظامِ تعلیم اور دیگر ذرائع کے ذریعے تمام افرادِ مملکت تک منتقل ہوتی ہے۔ اور یہی چیز ایک نظریاتی ریاست کی بقا اور ترقی کا باعث بنتی ہے۔ جب حکومت کی مہیّا کردہ تعلیمی سہولتوں سے ایک فرد کی نصب العین کے ساتھ محبّت بڑھتی ہے تو اس سے پُوری قوم کا فائدہ ہوتا ہے۔ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک ذمّہ دار فرد اپنی صلاحیتوں کو معاشرے کی فلاح و بہبود میں استعمال کرتا ہے اور دوسروں میں بھی خود آگہی اور علم و عرفان کے حصُول کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ عقلی و نفسیاتی سطح پر ایک فرد کا اپنے معاشرے اور بھائی بندوں کے لیے ایسا کرنا ایک قسم کی ادائیگی زکوٰۃ ہے۔ اسلامی ریاست کی حکومت ایسے مواقع بہم پہنچاتی ہے کہ ایک فرد اپنے علم کو دوسروں تک بسہولت منتقل کر سکے اور یہی چیز اس ریاست کی نہ صرف تقویت کا باعث بنتی ہے بلکہ اس کے وجود کی غرض و غایت بھی اسی صورت میں پُوری ہوتی ہے اور اسی لیے اسلامی ریاست میں وہی لوگ زمام کار سنبھالتے ہیں جو راست آدرش سے اعلیٰ ترین

محبّت رکھتے ہوں اور خود آگہی کی صفت سے متصف ہوں۔ اور پھر یہ ذمہ دار افراد ریاست کے دوسرے لوگوں میں ان اقدار کے نفوذ کی سعی بھرپور طور پر کرتے ہیں۔ خاص طور پر یہ افراد ملک کے نظامِ تعلیم کو خارجی اور اندرونی دونوں جانب سے کنٹرول کرنے اور اسے صحیح رُخ پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس طرح یہ افراد اور ریاست کے عام لوگ مِل جُل کر ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتے ہیں اور ریاست میں صحیح نصب العین سے محبّت و تعلّق پروان چڑھتا ہے۔

ریاست اور فرد باہم ایک گہرے رشتے میں منسلک ہیں اور ایک دوسرے کے لیے سامانِ زیست بہم پہنچاتے ہیں۔ ریاست کا وجود اور اس کی نظریاتی شناخت افراد پر منحصر ہے، اور دوسری طرف افراد ریاستی معاشرے اور اجتماعی نظم کے تعاون کے بغیر ترفّع اور کمال حاصل نہیں کر سکتے۔ فرد کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ودیعت شدہ صلاحیتوں کو نمایاں کرنے اور بروئے کار لانے کے لیے اجتماعیت سے مربوط ہو۔ جب کوئی فرد صرف اپنے انفرادی مفادات کے لیے کام کرتا ہے اور اجتماعی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے صرف ذاتی احتیاجات کو خود غرضی کے ساتھ پُورا کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے تو صحیح نصب العین سے اس کا قلبی تعلق کمزور پڑنے لگتا ہے اور اس کی انفرادی ترقی میں بھی کجی آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاکیداً حکم دیا ہے کہ ایک مومن مشکلات کے باوجود اور اپنی خود پسند خواہشات کے علی الرغم جماعت کے ساتھ جُڑا رہے اور اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرے:

علیکم بالجماعۃ مَن شَذَّ شُذَّ فی النّار۔

"تم پر فرض ہے کہ تم جماعت کے ساتھ رہو۔ جو کوئی جماعت سے کٹتا ہے آگ میں جھونکا جاتا ہے۔"

ارتقاء کے لیے اسلام کی اجتماعیّت پر تاکید

مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نماز جیسی عبادت بھی نہایت منظم اور مرتب انداز میں باجماعت ایک ایسے قائد کے پیچھے پڑھے جو علم اور نصب العینی عشق و محبّت میں سب سے بہتر ہو۔ نماز میں وہ کلمات کی ادائیگی اور حرکات و سکنات میں ایک خاص قاعدے قرینے کی سختی سے پابندی کرتا ہے

باجماعت نماز کی ایک غرض وغایت یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے تئیں ایسی اجتماعیت کا رکن تصور کرے جس کا ایک نظریۂ حیات اور مقصد تاسیس ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ جائے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات کو بھی صرف اجتماعی نظم سے وابستہ ہو کر حاصل کر سکتا ہے۔ نماز باجماعت گویا اس کی پوری زندگی کے لیے بمنزلہ اساس ہے۔ نماز کی پابند حرکات وسکنات اور امام کی اقتدا سے اس کے ذہن وقلب میں یہ حقیقت راسخ ہو جاتی ہے کہ وہ حسن ازلی سے تعلق اور نصب العینی محبّت کا کمال صرف جماعت کے ساتھ منسلک رہ کر حاصل کر سکتا ہے۔

ایک امام کی اقتدا میں نماز باجماعت کا نقشہ درحقیقت ایک مسلمان کی پوری زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسے اپنی زندگی کے جملہ امور کو مسلمانوں میں سب سے زیادہ بہتر اور متقی لیڈر کے تحت منظم ہو کر انجام دینے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو شخص سیاسی وسماجی امور کا سربراہ ہوتا ہے وہی نماز باجماعت میں امامت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام میں دینی اور دنیوی امور کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ اسی چیز کی اہمیت نمایاں کرنے کے لیے قرآن میں جا بجا باجماعت نماز اور قیامِ نظامِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے:

وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○ (البقرۃ: ۴۳)

"اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔"

اللہ کے حضور دعا مانگتے ہوئے بھی ایک مسلمان صرف اپنے آپ ہی کو نہیں بلکہ پوری مسلمان اجتماعیت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ ان الفاظ میں دعا کرتے ہوئے جمع کے صیغے کو استعمال کرتا ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (البقرۃ: ۲۰۱)

"اے ہمارے رَبّ ہمیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی خیر وخوبی سے نواز اور عذابِ جہنم سے بچا۔"

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ○ (البقرۃ: ۲۸۶)

"اے ہمارے پروردگار بھول چوک اور خطا وغلطی پر ہماری پکڑ نہ کر۔"

ایک مسلمان ریاست کے گوناں گوں اداروں کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ وہ تمام ایک مسلمان شہری کی اجتماعی زندگی کے لیے آسانی اور تقویت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ مسلمان پر فرض ہے کہ وہ پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے اپنے محلّے کی مسجد میں جائے اور لوگوں سے ملاقات کرے۔ نماز جمعہ کی ادائگی کے لیے اسے محلّے کی مسجد کے بجائے شہر کی بڑی مسجد یعنی جامع مسجد میں جانا ہوتا ہے جہاں وہ کثیر تعداد میں شہر کے مسلمان بھائیوں سے ملتا ہے پھر عیدین کے اجتماعات اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں جو شہر سے باہر ایک کھلے میدان میں منعقد ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں اسے شہر بھر کی مسلمان آبادی سے ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ اس سے آگے سالانہ حج بیت اللہ کے موقع پر دنیا بھر کے مسلمانوں کا بین الاقوامی سطح پر میل جول ہوتا ہے۔ ذوالحجہ کے مہینے میں حرمین اور عرفات اور منیٰ کے میدانوں میں دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے مسلمان ایک دوسرے سے ملتے اور باہم متعارف ہوتے ہیں۔ اسلام کی تمام عبادات چاہے وہ نماز ہو یا روزہ، زکوٰۃ کی ادائیگی ہو یا حج بیت اللہ، باطنی و روحانی اہمیّت کے علاوہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ تمام عبادات ایک مسلمان کو رُوحانی بالیدگی فراہم کرنے کے علاوہ مسلمانوں کے آپس کے تعلقات میں گرمجوشی اور محبّت و اخوّت کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ جوں جوں ایک مسلمان کا اجتماعی شعور بڑھتا ہے اور وہ معاشرے سے مثبت بنیادوں پر جڑتا ہے، اس کا نصب العین سے تعلق بڑھتا ہے اور اس میں گہرائی اور گیرائی مزید ترقی کرتی ہے۔ اور نصب العین سے اس کی محبت جس قدر بڑھتی ہے، وہ مسلمان معاشرے کی ترقّی، وحدت اور استقلال کے لیے مزید کام کرتا ہے۔

اطاعتِ امیر کی تاکید

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم نے جماعتی زندگی پر بے انتہا زور دیا ہے۔ یہ تاکید اس تعلیم سے بھی نکلتی ہے جو آپؐ نے نمازِ باجماعت میں امام کی اقتداء کے لیے دی ہے۔ امام کی تھوڑی بہت غلطی کے باوجود مقتدیوں پر لازم ہے کہ وہ امام کے پیچھے چلیں۔ امام کی غلطی کا وبال خود اس پر ہوگا لیکن نماز میں مقتدیوں کے لیے اجازت نہیں کہ وہ اس کے حکم کی

خلاف ورزی کریں۔ معلوم ہوا کہ نماز جیسی اہم عبادت میں بھی چھوٹی موٹی غلطی کو اہمیّت نہ دیتے ہوئے نظمِ جماعت کا خیال بہر حال ضروری ہے۔ معمولی اور غیر اہم اختلافِ رائے پر جماعت کا ساتھ چھوڑ دینا انتہائی ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ۔

”تم پر جماعت سے وابستگی لازم ہے۔ جو جماعت سے کٹا، آگ میں جھونکا گیا۔“

ایک مسلمان کے جماعت سے علیٰحدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پوُری اجتماعیّت کو خطرے میں ڈالتا ہے اور اس طرح مسلمان ریاست کی کارکردگی بحیثیّتِ مجموعی متأثر ہوتی ہے چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مردِ مومن خود اپنے دینی و دنیوی فائدے کے لیے اجتماعیّت کی قوت و استحکام کا ہر دم متمنی رہتا ہے، کیونکہ اجتماعیّت کا شیرازہ بکھرنے سے خود اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ رسولِ خدا کا حکم ہے کہ اپنے امیر کی بات سُنی جائے اور اطاعت کی جائے خواہ وہ ایک سیاہ فام حبشی غلام ہو۔ ایک اور اہم حدیثِ رسولؐ کا متن کچھ اس طرح ہے: ”جب تم ایک امیر کی اطاعت پر اتفّاق کر لو، تو پھر اگر کوئی شخص اس اجتماعیّت میں رخنہ ڈالے اور تمہاری اجتماعی قوّت کو پارہ پارہ کرے، تو تمہیں اسے تہِ تیغ کر دینا چاہیے۔“

اس جگہ پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کی اجتماعیّت کی مثال ایک زندہ جسم کی صورت میں دے کر مسئلے کی کیفیت مزید واضح کر دی ہے۔ جب ایک فرد کوئی غلط کام انجام دیتا ہے تو اس کے اعضاء و جوارح اس فعل کی انجام دہی میں اس کے تابع رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اعضاء و جوارح اس کا ساتھ چھوڑ جائیں۔ بالفرض اگر ایسا ہو تو پھر اس فرد کے لیے بعد میں اپنی اصلاح یا غلطی کی تلافی کا امکان نہ رہے گا۔ اگر اعضاء و جوارح اپنے مالک کا کہا نہ مانیں تو وہ بحیثیّتِ فاعل اپنا وجود کھو دے گا اور مستقبل میں اپنے تمام عزائم کی تکمیل میں مکمل طور پر ناکام رہے گا۔ اسی طرح ہماری اصل فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جماعت کے ساتھ رہیں، اِلاّ یہ کہ جماعت کی اکثریت یا امیر صریحاً غلط راستے پر چل نکلے۔ جس طرح ایک مسلمان اپنی زندگی کا رُخ کبھی کبھار غیر اخلاقی کام یا گناہ و معصیت میں غیر شعوری طور پر مبتلا ہونے کے باوجود صحیح رُخ پر رکھتا ہے، اسی طرح مسلم اجتماعیت معمولی غلطیوں کے باوجود اپنے مقصدِ اعلیٰ کی طرف ہی پیش قدمی کرتی ہے بشرطیکہ اس میں اتحاد و یگانگت کی صحیح

روح کارفرما ہو۔ تاہم یہ امر مسلّم ہے کہ اسلام نے امارت میں تبدیلی یا بہتری کے لیے پُر امن ذرائع اور آئینی اقدامات کا سہارا لینے کی اجازت دی ہے۔ اسلام جدید عمرانی تقاضوں کے ساتھ بخوبی چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مسلمان اپنی اجتماعیت کو یکجا رکھتے ہوئے بھی جدید سیاسی اور آئینی اقدامات کے ذریعے حکومت کے سربراہ کو بدل سکتے ہیں۔ البتہ اسلام اس بات کی تاکید ضرور کرتا ہے کہ مسلمان باہم جنگ و جدال یا انتشار کا شکار نہ ہوں۔

صحیح نصب العین کے مطابق عالمگیر ریاست کا ظہور ناگزیر ہے

سطورِ بالا میں دی گئی تصریحات سے ظاہر ہے کہ صحیح نصب العین پر مشتمل ایک مثالی ریاست کی حدود میں وسعت کی بے پناہ صلاحیت ہے، حتیٰ کہ یہ پوری دنیا پر محیط ہو سکتی ہے۔ تمام باطل نظریات رفتہ رفتہ اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر ختم ہو جائیں گے اور صرف اسلام کا حقانی نظریہ ہی عالمگیر ریاست کی صورت میں متشکل ہو گا۔ اسلامی ریاست کی بنیاد چونکہ اللہ تعالیٰ کی محبّت اور اس کے دین کی اطاعت ہو گی، لہٰذا اس کے افراد بھی باہمی طور پر اسی دینی جذبے کے حوالے سے مربوط ہوں گے اور پوری اُمّتِ مسلمہ ایک جسد کی طرح ہو گی۔ صرف توحید پر مبنی صحیح نصب العین سے محبّت ہی اختلافات کو ختم کر کے عالمگیر سطح پر لوگوں کو متحد کر سکتی ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ (التوبۃ: ۳۲)

"چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی اپنے منہ (کی پھونکوں سے) اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کیے اپنی روشنی کے اور خواہ کافروں کو (کتنا ہی) ناگوار گزرے!"

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (التوبۃ: ۳۳، الصّف: ۹)

"اسی نے بھیجا اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے پوری جنسِ دین پر اور خواہ مشرکوں کو (کیسا ہی) ناگوار گزرے!"

صحیح نصب العین کی فتح اور علوم

راست اور صحیح نصب العین کی باطل نظریات پر آخری فتح طبیعی علوم بالخصوص طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کے علوم میں ترقی سے قریب سے قریب آتی چلی جائے گی، کیونکہ ان علوم میں ترقی اور وسعت سے انسان آفاق و انفس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مطالعہ بڑے پیمانے پر کرسکے گا۔ وہ اس طرح نہ صرف خارج میں مادی کائنات کی وسعتوں کا مشاہدہ کرے گا، بلکہ نفسیاتی علوم میں ترقی سے اپنے باطن اور نفس کے حقائق کی معرفت بھی حاصل کرسکے گا۔ ان علوم اور قوانین پر دسترس انسان کو اس درجے حاصل ہو جائے گی کہ وہ قرآن حکیم کی اس آیت مبارکہ پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا نظر آئے گا:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (حٰمٓ السجدۃ: ۵۳)

"ہم انہیں عنقریب آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ یہ حقیقت ان پر کھل جائے گی کہ یہ (قرآن) حق ہے۔"

مستقبل کی اسلامی ریاست امن پسند اور امن کا گہوارہ ہوگی

مستقبل میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست اپنی ہم عصر ریاستوں سے نصب العین کے اختلاف کے باوجود انتہائی پُر امن اور خوشگوار تعلقات رکھے گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک صاحبِ ایمان کے لیے صحیح نصب العین کی محبّت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے معتقدین کے ساتھ نظریاتی اختلاف کے باوجود بے لوث اور پُر خلوص محبّت کے روابط رکھے۔ ان حقائق کا اسے پُورا شعور و ادراک ہوتا ہے کہ:

(۱) تمام انسان بنیادی طور پر اپنی فطرت کے اعتبار سے اچھے ہیں اور صحیح نصب العین ہی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے اعتقاد اور عمل میں جو کجی آتی ہے وہ سماجی حالات اور غلط نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہی چیز انہیں غیر معقول رویّے، ضد، ہٹ دھرمی اور ظلم و تعدّی پر

ابھارتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ وہ کم فہمی اور حقائق سے بے خبری کی بنا پر کرتے ہیں۔

(۲) تمام انسان ایک خدا (وحدہٗ لاشریک لہٗ) کی مخلوق ہیں اور وہ ان سب کا رب ہے اور ان سے محبّت کرتا ہے۔ وہ ان سب کے بارے میں چاہتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر چل کر اس کے انعام کے مستحق بنیں۔ چنانچہ اس تعالیٰ نے تمام انسانوں کو زندگی بسر کرنے کے وسائل و اسباب اور صحیح نصب العین تک پہنچنے کے مواقع کم و بیش یکساں عطا کیے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس تعالیٰ نے تمام اُمّتوں کو نبیوں کے ذریعے اپنے اوامر و نواہی سے باخبر کیا ہے۔

(۳) ایک مسلمان پر یہ فریضہ دینی طور پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی جملہ مخلوق سے نہ صرف محبّت کرے، بلکہ ان کی فکری و روحانی بالیدگی اور ارتقاء کے لیے سعی و جہد بھی کرے۔ پوری بنی نوع انسان کے درمیان بھائی چارے اور اخوت کی طرف اشارہ رسولِ مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک میں ملتا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَشْهَدُ اَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَ اَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ۔

"اے پروردگار! میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں، اور یہ کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔"

(۴) انسانوں کے ساتھ خیر خواہی اور انہیں ایمان و اسلام کی طرف بلانے کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبّت کی جائے اور حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے۔ ان کے لیے روحانی بالیدگی کی خواہش و عزم کسی طور بھی ان کے ساتھ نفرت سے میل نہیں کھاتے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (بنی اسرائیل: ۵۳)

"اور میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ ایسی بات کریں جو اچھی ہو۔"

اسی طرح کلام پاک میں ایک اور جگہ بُرائی کے بدلے اچھائی کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۴)

"جواب میں وہ کہو جو اُس سے بہتر ہو۔ پھر (تم دیکھ لوگے کہ) تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا گویا کہ گرمجوش دوست ہے۔"

خوش خلقی اور حسنِ سلوک کو دعوتِ دین کے ضمن میں بھی پیشِ نظر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ النحل کی آیت ۱۲۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ (النحل: ۱۲۵)

"بلاؤ اپنے ربّ کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے اور اُن کے ساتھ ایسے طریقے پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو۔"

(۵) مسلمانوں یعنی اہلِ ایمان کو یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ کسی پر کوئی عقیدہ ٹھونسا جا سکتا ہے اور نہ کسی کے دل میں کسی نصب العین سے بالجبر محبّت کے جذبات پروان چڑھائے جا سکتے ہیں۔ نصب العینی محبّت آزاد مرضی اور آزادی کے ماحول میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم زبردستی کسی کے دل میں کوئی عقیدہ یا محبّت پیدا نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کا اظہار واشگاف الفاظ میں اِن الفاظِ قرآنیہ میں کر دیا ہے:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ۙ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ج

(البقرۃ: ۲۵۶)

"دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے، بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے۔"

(۶) افکار کی قوّت اسلحے کی قوّت سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ کہ بالآخر وہی نظریۂ حیات ہر جگہ غالب آکر رہے گا جو عقلی اور سائنسی بنیادوں پر استوار ہو۔ چنانچہ ایک صاحبِ ایمان کو اپنے دین کی اشاعت اور غلبے کے لیے دوسرے نظریاتِ حیات سے خواہ مخواہ مخاصمت مول نہ لینی چاہیے۔ ایک اسلامی ریاست اپنی حدود کے اندر غیر مسلموں کو مکمل تحفّظ اور مذہبی آزادی فراہم کرتی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات مسلمانوں کو اپنی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک، رواداری اور امن و آشتی کا حکم دیتی ہیں۔ انہیں اپنے مذہب کے مطابق عمل کی آزادی دینا مسلمان مملکت کا فرض ہے۔

وہ حالات جن میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے

لیکن اپنی جگہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کوئی باطل نظریہ بہت منہ زور اور جارحانہ ہو جائے اور لوگوں کو طاقت کے بل پر کفر پر ابھارے، تو پھر مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور اس کی سرکوبی کریں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اگرچہ کوئی صاحب ایمان کسی دوسرے غیر مسلم شخص سے نفرت نہیں کرتا، لیکن اگر وہ اپنے باطل نظریات کو بالجبر پھیلاتا ہے اور دوسرے لوگوں کو حق سے برگشتہ کرتا ہے یا حق کی طرف آنے سے روکتا ہے تو پھر مسلمان کا خاموش تماشائی بنے رہنا صرف منافقت کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ وہ صاحب ایمان ہوتے ہوئے اپنی پوری طاقت سے اس باطل کو دبانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ حق کی دعوت سن کر آسانی سے اس کی طرف آ سکیں اور اپنی روحانی تسکین و بالیدگی (ارتقاء) حاصل کر سکیں اور اس سلسلے کے تمام موانع دور ہو سکیں۔ انہی حالات میں وہ جہاد کا علم بلند کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی جانب سے سرکشوں کی سرکوبی کر کے بنی نوع انسان کی حق کی طرف پیش قدمی کو آسان بناتا ہے۔ اسلام صرف کشور کشائی یا مالِ غنیمت کے لیے جنگ کے خلاف ہے، لیکن جب باطل حق کا راستہ روکے تو پھر یقیناً مسلمانوں کو باطل قوتوں سے ٹکرانے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں آنحضور صلعم اور آپ کے صحابہ کرام کی سیرت و کردار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ۔ (الفتح: ۲۹)

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (مگر) آپس میں رحم دل ہیں۔"

مسلمانوں کی یہی کیفیت سورۃ المائدۃ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ (المائدۃ: ۵۵)

"نرم دل ہیں اہلِ ایمان پر (جبکہ) زبردست ہیں کافروں پر، جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ

ہیں اور نہیں ڈرتے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے۔"

ان آیاتِ مبارکہ میں مسلمانوں کی ان کفّار پر سختی کا ذکر ہے جو فقہی اصطلاح کے مطابق حربی کافر ہوں، یعنی وہ اپنے غلط نصب العینوں کے ضمن میں بہت متشدّد ہوں اور دوسروں کو بھی جبر کے ساتھ اپنے راستے پر چلنے پر زور دیں گویا اس طرح یہ کفّار از خود حق کو مسلّح تصادم کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک صاحبِ ایمان پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کے کسی کافر کے ساتھ دلی محبّت و الفت کا رشتہ نہ رکھے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی اپنے دین کے ساتھ وابستگی ڈھیلی اور مشکوک ہے۔ کفّار اور غلط نظریات رکھنے والوں کے ساتھ قلبی تعلّق اور بھائی چارہ باطل کے ساتھ سازباز کے مترادف ہوگا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کا مطلب حق کے مقابلے میں باطل نظریات اور قوتوں کے ساتھ تعاون ہوگا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ج

(آلِ عمران: ۲۸)

"اہلِ ایمان مومنین کو چھوڑ کر (ان کے بجائے) کفّار کو اپنا ولی و غم خوار نہ بنائیں۔"

مزید برآں سورۃ المائدۃ کی دوسری آیت میں حکم دیا گیا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ص وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص (المائدہ: ۲)

"اور نیکی اور پرہیزگاری (کے کاموں) میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی (کے کاموں) میں تعاون نہ کرو۔"

مسلم ریاست میں بھی جملہ غیر مسلموں کے جان و مال کی حفاظت اور مذہبی آزادی کی ذمّہ داری اسی وقت تک نبھائی جاتی ہے جب تک وہ ریاست کے مفادات کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہوں یا اپنے نظریات کی دعوت و تبلیغ صرف اپنے اہلِ مذہب میں کریں۔ تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ باطل نظریاتِ حیات کی اکثریت حق کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف سرگرمِ عمل ہو جاتی ہے اور یہی چیز تاریخ میں ادیان اور نظریات کے درمیان مسلسل آویزش کا سبب بنی ہے۔ اگر کہیں جنگ ختم ہوئی بھی ہے تو اس پُرامن وقفے کو زیادہ بڑے پیمانے کے تصادم کے لیے تیاری

میں صرف کیا گیا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حق یعنی راست نظریۂ حیات کو مجبوراً غلط نظریات کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑتے ہیں۔ لیکن اس تصادم اور کشمکش میں ہمیشہ دینِ حق کو ہی فتح نصیب ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ نظریۂ حیات ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور انسان کے مادی و روحانی ارتقاء کی ضمانت دیتا ہے۔ حق و باطل کے درمیان کشمکش اور تصادم کا اشارہ مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنیہ میں ملتا ہے:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ (الانبیاء: ۱۸)

"بلکہ ہم تو حق کو باطل پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر کچل ڈالتا ہے۔ پھر وہ اسی دم ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔"

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل: ۸۱)

"اور (اے پیغمبر) اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل نیست و نابود ہوا۔ بیشک باطل تو نیست و نابود ہی ہونے والا ہے۔"

باطل نظریات کی بنیادیں چونکہ کمزور ہوتی ہیں، اس لیے وہ کبھی بھی انسانوں پر اپنا تسلّط قائم نہیں رکھ سکتے۔ جہاں کہیں بھی باطل کا غلبہ ہوتا ہے، تھوڑے ہی عرصے میں لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور علمِ بغاوت بلند کر کے اس کے زوال و انحطاط کا باعث بنتے ہیں۔

اسلام اور انسانی ارتقاء

سطورِ بالا میں چونکہ میں نے لفظ 'ارتقاء' کا استعمال متعدّد بار کیا ہے، اس لیے اس کے ضمن میں قدرے وضاحت ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء کا تصوّر اسلام میں نیا نہیں ہے۔ قرآن کی پہلی آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ تمام عالمین کا ربّ یعنی مربّی و پالنہار ہے۔ اسی طرح وہ آسمانوں اور زمین کا ربّ بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ تاہم ترقی پذیری اور ارتقاء کے اصُول از رُوئے قرآن وہ نہیں ہیں جو ڈاروِن یا دوسرے مادیّت پسند مفکّرین نے تنازع للبقاء یا

فطری انتخاب کی صورت میں بیان کیے ہیں۔ ارتقاء کے پیچھے اصل کارفرما اصول یا قوّت مشیّتِ ایزدی کی ہے۔ خدا کی بنیادی صفات میں سے صفتِ ربوبیت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی مرضی کے مطابق مختلف مخلوقات کو ارتقائی منازل سے گزار کر اپنی اعلیٰ ترین حالت تک لے جاتا ہے ڈارون اور ہکسلے کے مقابلے میں فرانسیسی مفکّر برگساں کا فلسفۂ تخلیقی ارتقاء قرآن کے نظریۂ ارتقاء کے زیادہ قریب ہے۔ برگساں نے چونکہ اپنا فکر انتہائی معقول مسلّمات پر استوار کیا ہے اس لیے وہ میکانکی ارتقاء کے مقابلے میں زیادہ قابلِ فہم اور قرینِ قیاس ہے۔ چنانچہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید دونوں ادوار کے بعض اہم مسلمان مفکّرینِ قرآن ارتقائی نقطۂ نظر کے حامل ہیں مثلاً جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) ابن مسکویہ (متوفی ۴۲۱ھ کتاب الفوز الاصغر)، رومی، اقبال، طنطاوی وغیرہ۔ قرآن میں وارد شدہ قصۂ آدم پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

"لہٰذا قرآن مجید نے ہبوطِ آدم کا ذکر کیا تو یہ بیان کرنے کے لیے نہیں کہ کرۂ ارض میں انسان کا ظہور کس طرح ہوا۔ اس کے پیشِ نظر حیاتِ انسانی کا وہ ابتدائی دور ہے جب اس پر جبلّی خواہشات کا غلبہ تھا اور جس سے گزر کر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات میں آزاد اور اس لیے شک اور نافرمانی دونوں کا اہل ہے۔" (صفحہ ۸۵)

اسی طرح کرۂ ارضی میں انسان کے ظہور پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال سورۃ الواقعہ کی مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنیہ نقل کرتے ہیں:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۝
عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝
وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ۝

(الواقعۃ: ۶۰-۶۲)

"ہم ہی نے تم میں موت کو مقدر کر رکھا ہے اور ہم عاجز نہیں ہیں اس سے کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور ایک اور ہستی میں جس کو تم نہیں جانتے تم کو بنا کھڑا کریں۔ اور تم جان چکے ہو (اپنی) پہلی پیدائش کو، پھر سبق کیوں نہیں لیتے"

آگے چل کر علامہ لکھتے ہیں:

"لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی نشاۃ الاولیٰ کیوں کر ہوئی۔ ہم نے ابھی چند آیات کا حوالہ دیا تھا۔ ان کے آخری حصّے میں جن حقائق پر توجہ دلائی گئی ہے یہ انہی کا نتیجہ تھا کہ فلاسفۂ اسلام کی آنکھوں میں حقیقت کی ایک نئی جھلک عیاں ہوگئی۔ جاحظ (متوفی: ۲۵۵) پہلا شخص ہے جس نے ان تغیّرات کی طرف اشارہ کیا جو نقلِ مکانی، علیٰ ہذا ماحول کے زیرِ اثر حیوانات کی زندگی میں بالعموم رونما ہو جاتے ہیں۔ آگے چل کر جاحظ کے ان نظریات کو اس حلقے نے جو 'اخوان الصّفا' کے نام سے مشہور ہوا مزید وسعت دی۔ ابن مسکویہ (متوفی: ۴۲۱ھ) پہلا مسلمان مفکّر ہے جس نے انسان کے مبدا و مصدر کے بارے میں ایک واضح اور متعدد پہلوؤں سے ایک جدید نظریہ پیش کیا۔ بعینہٖ یہ بھی ایک قدرتی امر تھا۔ علیٰ ہذا قرآن کی روح کے عین مطابق کہ رومی بقائے دوام کے مسئلے کو ارتقائے حیات ہی کا ایک مسئلہ ٹھہراتا، کیونکہ ہم اس کا فیصلہ صرف مابعد الطبیعی دلائل کی بنا پر نہیں کر سکتے جیسا کہ بعض فلاسفۂ اسلام کا خیال تھا۔ لیکن پھر عصرِ حاضر میں تو اس نظریے سے زندگی کے بارے میں امید و وثوق اور ذوق و شوق کی بجائے مایوسی اور افسردگی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس دَور نے بغیر کسی دلیل کے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہم انسان اپنے ارتقاء کی جس منزل میں ہیں اسے نفسیاتی یا عضویاتی جس لحاظ سے بھی دیکھا جائے ہمارے ارتقاء کی آخری منزل ہے۔ لہٰذا بحیثیّت ایک حادثۂ حیات کے موت میں کوئی تعمیری پہلو مضمر نہیں۔ دراصل عصرِ حاضر کو آج ایک رومیؔ کی ضرورت ہے جو دلوں کو زندگی، امید اور ذوق و شوق کے جذبات سے معمور کر دے۔ مولانا رومیؒ کے یہ اشعار کس قدر بے نظیر ہیں۔

آمدہ اوّل بہ اقلیمِ جماد — وز جمادی در نباتی او فتاد

سال ہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد

وز نباتی چوں بحیوانی فتاد — نایدش حالِ نباتی ہیچ یاد

جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں — خاصہ در وقتِ بہارِ ضیمراں

ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

عقلہائے اولینش یاد نیست — ہم ازیں عقلش تحوّل کردنیست"

بحث کے اس مرحلے پر قاری کے ذہن میں اُبھرنے والے چند سوالات کے جواب میں ہمیں اختصار

کے ساتھ دُوں گا۔ پہلا اہم ترین سوال جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ رسالت کی غرض وغایت یا سبب کیا ہے؟ اور یہ کہ آخر کس بنیاد پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض کو اس منصبِ جلیلہ پر فائز کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ نبوّت و رسالت کے اجراء کا تعلّق کائنات میں جاری ارتقائی عمل سے ہے اس لیے خود اس کی توجیہہ بھی عمومی انسانی ارتقاء کے اغراض و مقاصد اور اسباب و علل کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔

ارتقاء کے اسباب

جیسا کہ سطور بالا میں تصریح کی جا چکی ہے ارتقاء کا اصل سبب خالقِ کائنات کی مشیت ہے جو کائنات میں ایک لہر کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہی ارادہ و مشیت کائنات کو مختلف ارتقائی مراحل سے گزار کر اکمل ترین مرحلے تک پہنچاتا ہے۔ شعور کی یہ لہر، یا یہ قوّتِ ارادہ حیوانی سطح تک زندگی، جوشِ حیات (برگساں کے الفاظ میں) یا شعور تک محدود رہتا ہے۔ انسانی سطح پر یہ فرائڈ کے الفاظ میں 'لیبیڈو' کی شکل اختیار کر لیتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ جنسی تحریکات اور خواہشات کا محور نہیں بلکہ حسنِ ازلی اور کمالِ ذات کے حصول کا خواہاں ہے اور اس کا ظہور نصب العین سے محبّت کی شکل میں ہوتا ہے۔

چونکہ کائنات کے ارتقاء میں بھی بالعموم کمالِ ذات کی طرف رجحان ہے اس لیے حیوانوں کی سطح پر اس خواہشِ کمال کا مظہر حیاتیاتی اعتبار سے مکمّل ترین ذی حیات نوع یعنی انسان کی آمد ہے۔ خواہش کمال انسانی سطح پر ایک ایسے مکمّل انسانی معاشرے کی تشکیل پر ابھارتا ہے جو اکمل ترین نظریۂ حیات پر استوار ہو اور نفسیاتی اور اخلاقی ہر دو اعتبارات سے جامع اور مکمّل ہو۔

ارتقاء کی نفسیاتی سطح پر تبدیلیاں

انسانی ارتقاء دو سطحوں پر ہوا ہے: ایک[1] خالصتاً حیوانی سطح پر جس میں فطرت نے حیاتیاتی اصولوں یعنی انواع میں لمبے عرصے پر محیط تغیّر و تبدّل یا فوری تبدیلیوں کے تحت ارتقائی صورتیں اختیار

کیں۔ دوسرے[1] نفسیاتی سطح پر جس کی اعلیٰ ترین ارتقاء یافتہ شکل نبوّت ہے۔ مؤخّر الذکر ارتقاء پہلی نوع کے ارتقاء ہی کی ایک مختلف سمت میں ترقی پذیری کی صُورت ہے۔ شعور (یعنی خالق کائنات کی وہ قوّت جو کائنات میں جاری وساری ہے) کی یہ خصوصیت ہے کہ نامساعدت اور مخالفت سے اس کی فعّالیت بڑھتی ہے۔ اسے جب کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اسے حد درجہ مخالفت درپیش ہے تو اس صورت میں وہ دفعتًہ ایک غیر معمولی ارتقائی قدم اُٹھاتے ہوئے ایک زقند لگاتی ہے۔ حیوانی دنیا میں شعور کی اس قسم کی مساعی نے انواع میں اچانک تبدیلیوں کی شکل اختیار کی ہے، گویا بالکل معجزانہ طور پر ماقبل نوع کی ایک ترقی یافتہ اور مختلف نوع میں تبدیلی۔ عالمِ انسانی میں رکاوٹ اور مخالفت کے دَوران شعور جب ایک غیر معمولی زقند لگاتی ہے تو اس صورت میں خود شعوری سے لبریز ایسے انسان معرضِ وجود میں آتے ہیں جنہیں ہم انبیاء کہتے ہیں۔ جب کسی معاشرے کے اعتقاد اور کردار میں اتنی پستی آجائے کہ وہ صحیح نصب العین کے تقاضوں کے خلاف کھلی بغاوت کرے تو اس کیفیت میں ارتقاءِ انسانی کی سطح پر شعور کو مخالفت کا سامنا ہوتا ہے اور وہ اس کا مقابلہ ایک غیر معمولی سعی سے کرتی ہے اور نتیجتًہ اس معاشرے میں ایک ایسا شخص ظاہر ہوتا ہے جسے فطرت نے خود شعوری کا ایک خاص عطیہ عنایت کیا ہوتا ہے اور اس میں نصب العین کی محبّت بتمام وکمال ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی صحیح نصب العین کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے ان کے دِلوں میں اس کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور انہیں از سرِ نو ارتقاء کے راستے پر ڈالتا ہے ایسا شخص منصبِ نبوّت کا حامل ہوتا ہے۔ اخلاقی طور پر تنزّل پذیر معاشرے میں کسی نبی کی اچانک بعثت ایسی ہی ہے جیسے اس جگہ طوفان کا آنا جہاں فضا میں ہوا کا دباؤ بہت کم ہوجائے یا جیسے کسی بیماری کے پیشِ نظر کسی جاندار ہستی کا ایسا غیر ارادی فعل جس سے دوبارہ صحت بحال ہوجائے۔

اس ضمن میں دوسرا سوال[2] جو قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، یہ ہے کہ کیا تمام انبیاء مساوی طور پر خود شعوری کا وصف رکھتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ان کی تعلیمات میں فرق وتفاوت کیوں

---

[1] اس سلسلے کا پہلا سوال اور اس کا جواب کہ رسالت کی غرض وغایت اور اس کا سبب کیا ہے گزشتہ قسط کے اختتام پر دیکھا جاسکتا ہے، جو اگست ۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

ہے باوجودیکہ ان کی تعلیمات کی بنیاد ایک ہی ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انتہادرجے کی خودشعوری رکھنے کے اعتبار سے تمام انبیا یکساں ہیں اور ان میں کوئی اُونچ نیچ نہیں ۔ یہ بھی درست ہے کہ ہر نبی انسانیت کو صحیح نصب العین کے عملی تقاضوں کی تعلیم دیتا ہے لیکن ہر نبی کا علم وعرفان اُس معاشرے کے ذہنی، اخلاقی اور مادی کوائف کے متناسب ہوتا ہے جس میں وہ مبعوث کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار بالخصوص کسی بھی نبی کی عملی تعلیمات کے نمونے میں ملتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کی تعلیمات میں فرق اسی سبب سے ہے چونکہ مختلف معاشرے مختلف ادوار میں ارتقاء کے مراحل سے گزرتے رہے ہیں اس لیے کسی نبی کے لیے بھی یہ ضروری نہ تھا کہ وہ صحیح نصب العین کا اطلاق زندگی کے ہر گوشے مثلاً قانون، تعلیم، اقتصادیات، جنگ، انفرادی و اجتماعی زندگی وغیرہ کے لیے حتمی اور آخری درجے میں بتائے۔ اس کی تعلیمات معاشرے کی عمومی ارتقائی صورت کے مطابق ہوتی تھیں۔ چنانچہ خود انبیاء کی تعلیمات میں بھی ارتقاء ہوا ہے تاکہ وہ فرد اور اجتماع دونوں کو اپنے ارتقائی مرحلے کی مناسبت سے راست نصب العین کے لیے راہنمائی فراہم کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بنیاد اور ماخذ کے باوجود انبیاء کی تعلیمات میں فرق و امتیاز ہے۔ یہ فرق مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر۳: نبوّت کے اختتام یا تکمیل کا کیا سبب ہے ؟ اگر نبوّت کے ذریعے فطرت ارتقاء کی مدد کرتی ہے تو یہ انسان کے ارتقاء کے آخری مراحل سے قبل کیوں منقطع کردی جاتی ہے ؟

جواب: تخلیق کی نفسیاتی سطح پر کسی طبعی نصب العینی معاشرے کی مثال تخلیق کی حیاتیاتی سطح پر کسی طبعی نوع جیسی ہے۔ جس طرح نئی حیاتیاتی نوع کا پہلا فرد ایک مخصوص نوع کے آغاز کا باعث بنتا ہے اسی طرح نفسیاتی سطح پر ایک نئے انسان یعنی نبی کی آمد اور اس کے متبعین ایک مخصوص نصب العینی کمیونٹی کی تخلیق کرتے ہیں۔

حیاتیاتی سطح پر تغیّر و تبدّل کا انقطاع

حیوانی دنیا میں انواع میں فوری تغیّر و تبدّل کا عمل اس وقت ختم ہوگیا جب ایسا نامیاتی وجود

منصّۂ شہود پر آ گیا جس میں از خود مستقبل میں ارتقاء کے تمام امکانات موجود تھے یعنی جس کا دماغ اتنا ترقّی یافتہ تھا کہ وہ شعور میں موجود گوناں گوں عواطف و میلانات کے اظہار کے قابل تھا، اور مستقبل میں ان کے ارتقاء کی ضمانت بھی دے سکتا تھا۔ ایسے نامیاتی وجود کا کامل ترین نمونہ حیاتِ انسانی ہے۔ اس نوع کے متشکّل ہونے کے بعد شعور نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کسی اور اعلیٰ تر نوع کی صورت گری کے لیے کوئی غیر معمولی جست لگائے، کیونکہ اس کے داخلی ارتقاء کے لیے کوئی بندش اور تحدید نہ تھی۔ چنانچہ نئی انواع کے لیے تخلیقی عمل خود بخود منقطع ہو گیا۔

نظریاتی سطح پر تغیّر و تبدّل کا انقطاع

بالکل اسی طرح عالمِ انسانی میں اس کے متوازی مظہر یعنی نبوّت کو بھی منقطع ہونا چاہیئے۔ اور بالفعل یہ اُس وقت ہوا جب ایسے نبیؐ کی بعثت ہوئی جس کی تعلیمات ہر اعتبار سے مکمل تھیں، نفسیاتی اور نظریاتی ہر دو اعتبار سے مستقبل میں تمام مواقع کے لیے راہنمائی فراہم کر سکتی تھیں، اور فطری انسانی صلاحیت کو انسانی زندگی کے جملہ گوشوں میں راست نصب العین سے مربُوط کر سکتی تھیں۔ اس نبیؐ کی اپنی عملی مثال پُوری انسانیت کے لیے ہمیشہ کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نبی کا اسوۂ حیات ایسا ہونا چاہیے جس میں حیاتِ انسانی کے ارتقاء پر کوئی قدغن نہ آئے بلکہ وہ اپنی کامل ترین صُورت میں متشکّل ہو سکے۔ ایسے نبی کے اسوہ کا اتباع معاشرے کے عمومی ارتقاء میں نہ صرف ممد ہوتا ہے، بلکہ اسے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتا ہے۔ اس نبی کی بعثت کے بعد کسی اور نبی کے آنے کی چنداں حاجت نہیں رہتی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں نہ صرف نبوّت کی تکمیل ہوئی، یہ اختتام پذیر بھی ہوئی۔ آپؐ کی تعلیمات میں بالقوّہ یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تاقیامِ قیامت انسانیت کے ہمہ جہتی ارتقائی عمل کے لیے راہنمائی دے سکے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی گوشے میں بھی رکاوٹ یا جمود کا باعث نہ بنے۔ اب یہ آنحضورؐ کی اُمّت کا فرض ہے کہ وہ ان تعلیمات کا نور چار دانگِ عالم میں پھیلائے اور پُوری دنیا میں حق کا بول بالا کرے۔ اور اسی آخری فطری ہدایت کے لیے مقدّر ہے کہ وہ پُورے عالم پر چھا جائے جس طرح حیوانی عالم کے ارتقائی تغیّر و تبدّل میں انسان کا ظہور اس امر کا اعلان تھا کہ وہ اپنی نوعی اور دماغی

افضلیت کی وجہ سے اپنے اقتدار کا سکّہ پورے حیاتیاتی عالم پر جمائے گا، اسی طرح نبی آخر الزماں خاتم الانبیاءؐ کے پیروکار اپنی فکری و نظری فضیلت کی بنا پر پوری دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہونگے۔

تکمیل و اختتام: عمومی فطری قانون

شعور یا حیات کا نبوّت کا سلسلہ مکمل کر کے منقطع کر دینا صرف مظہرِ نبوّت سے مختص نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عمومی اصول کے طور پر ہر جگہ کار فرما ہے۔ ہر تخلیقی عمل اپنی انتہائی اور کامل ترین شکل پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ جب کوئی انتہائی صورت متشکّل ہوتی ہے تو تخلیقی عمل کی ماہیت بدل جاتی ہے اور وہ ایک دوسری سمت میں ارتقائی سفر شروع کر دیتا ہے جس کے لیے پہلی تکمیلی صورت بمنزلہ بنیاد ہوتی ہے۔ پھر قدم بہ قدم یہ ارتقائی عمل اس جہت کی اکمل ترین صورت کی طرف بڑھتا ہے اور اس طرح یہ عمل سدا رواں دواں رہتا ہے۔

فردِ انسانی کے عملِ نمو میں نقطہ ہائے کمال

ہم اپنی نگاہ فردِ انسانی کے ارتقائی و نموئی عمل سے کائناتی ارتقاء کی طرف لے جائیں تو ہمیں ان دونوں میں مندرجہ بالا ایک ہی اصول کار فرما نظر آتا ہے۔

مادی سطح پر ارتقائی عمل اپنے نقطۂ عروج اور تکمیل کو اس وقت پہنچا جب وہ تیاری کے جملہ مراحل سے گزر کر نامیاتی خلیہ پیدا کرنے کے قابل ہوا اور پہلا نامیاتی خلیہ معرضِ وجود میں آیا۔ وہ ارتقائی عمل جو اب تک باعتبار نوعیّت صرف طبعی یا کیمیائی قسم کا تھا اب بدل کر حرکی یا حیاتیاتی نوعیت اختیار کر گیا۔ بعد میں خود یہ نامیاتی خلیہ ترقّی کرتے کرتے اس قابل ہوا کہ اس کی تکمیل ایک ایسے انسان کی پیدائش کی صورت میں ہوئی جس کا دماغ مکمل طور پر وضع شدہ تھا اور اس میں نصب العینوں کی محبّت کا جذبہ بھی موجود تھا۔ پہلا تکمیلی مرحلہ مؤخّر الذکر تکمیلی مرحلے کے لیے شرط لازم تھا کیونکہ انسانی جسم بے شمار نامیاتی خلیوں ہی کا مجموعہ ہے۔ انسان کے وجود میں آنے کے بعد ارتقائی عمل نے اپنی نوعیّت بدلی اور حیاتیاتی سطح سے آگے بڑھ کر نظریاتی یا نفسیاتی سطح پر اپنا سفر جاری رکھا تا آنکہ دنیا میں پیغمبروں یعنی نصب العینی انسانی معاشروں کے اماموں (Leaders) کی آمد ہوئی پھر شعور

نبوّت میں بھی ارتقاء ہوا حتیٰ کہ آخر میں خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور آپؐ نے مکمل ترین نصب العینی کمیونٹی تشکیل دی۔ گویا ارتقاء کا ہر پہلا نقطۂ عروج دوسرے عروج کے لیے بنیاد بنا اور پھر دوسرا تیسرے ارتقائی عمل کے نقطۂ عروج کے لیے بنیاد بنا۔ اور یہ تیسرا نقطۂ تکمیل اُس وقت تک اپنا عمل جاری رکھے گا جب تک کہ پوری انسانیت من حیث المجموع اپنے نقطۂ کمال تک نہیں پہنچ جاتی۔

خاتم الانبیاء کا دین: بعد کے فکری ارتقاء کی ناگزیر بنیاد

جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے ہمیں فطرت کے تخلیقی عمل میں درجہ بدرجہ نقطہ ہائے کمال نظر آتے ہیں۔ ہر نقطۂ کمال ماقبل ارتقائی عمل کا نقطۂ عروج اور بعد میں وقوع پذیر ہونے والے عمل کے لیے اساس فراہم کرتا ہے۔ ارتقائی عمل کا انداز ایک وحدت کا سا ہوتا ہے یعنی اس کے مختلف اجزاء باہم دگر اتنے مربوط ہوتے ہیں کہ وہ ایک کُل کی حیثیت سے سرگرم عمل رہتا ہے اور ارتقائی عمل میں مختلف مدارج پر مظاہر اس کُل کے ساتھ ربط کے حوالے سے بامعنی بنتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض مظاہر مرکزی وحدانی ساخت سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور اصل اہمیت ان مظاہر ہی کی ہوتی ہے جو اصل ارتقائی شکل سے ہم آہنگ ہوں۔ اس استدلال کا لازمی نتیجہ نہ صرف یہ نکلتا ہے کہ نبوت کو بھی لامحالہ کسی نبی کی ذات میں تکمیل اور اختتام تک پہنچنا ہے، بلکہ یہ بھی کہ اس خاتم الانبیاء کا اسوہ مستقبل میں انسانی حیات کے ہمہ جہتی ارتقاء کے لیے اساس فراہم کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت نسل انسانی کی وحدت اور اس کے مسلسل و پیہم ارتقاء کے لیے شرط لازم ہے۔ اگر سلسلہ نبوّت کا اختتام نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نسل انسانی میں نہ وحدت پیدا ہو گی اور نہ ہی اس کے تہذیبی طور پر مستقل نشوونما کی ضمانت ملے گی۔ صرف صحیح نصب العین سے تعلق کی وجہ سے وہ اساس حاصل کی جاسکتی ہے جس کو اپنانے سے پوری نوع انسانی ایک وحدت کی لڑی میں پروئی جاسکتی ہے۔ اور صرف نبی آخر الزماں کی تعلیمات میں وہ جامعیت ہو سکتی ہے جو اس وحدت کو ممکن بنا سکے۔

ذہنِ انسانی کا زائیدہ مذہب انسانوں کو ایک وحدت میں نہیں پرو سکتا

بعض مفکّرین نے انسانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی ہے کہ تمام ادیانِ عالم کے مشترک نکات کو اکٹھا کر کے ایک نیا مذہب اختراع کیا جائے۔ لیکن اس بات کے علاوہ کہ یہ تجویز عملی مشکلات رکھتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے خود ساختہ مذہب پر انسانیت نہ کبھی جمع ہو گی اور نہ ہی اسے صحیح معنوں میں اپنائے گی۔ اس قسم کا خود ساختہ مذہب انسان میں معبودِ حقیقی کی محبّت پیدا کرنے سے بھی قاصر رہے گا۔ صرف ایک ایسا دین ہی جسے خالقِ کائنات نے کسی چنیدہ بندے پر اتارا ہو اور اس نبی نے اسے عملاً نافذ کیا ہو ــــــ لوگوں کے دِلوں میں اپنے ربّ کی حقیقی محبّت و عبودیت کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔ وحدتِ ادیان کا فلسفہ اگرچہ تاریخ میں کئی بار پیش کیا گیا ہے، لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ کسی ایسے فلسفیانہ مذہب کے پیروکار تعداد میں معتدبہ ہوئے ہوں یا وہ زیادہ عرصے تک قائم رہ سکا ہو۔ کسی بھی ایسے مذہب کے عقیدت مند رفتہ رفتہ اتنے کم ہو جاتے ہیں کہ اس کا وجود بھی تاریخ کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے دوغلے جانور کی ہے جو اپنی نسل خود قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہر ایسا غیر فطری نظریۂ حیات جو بذریعہ وحی انسان کو نہ دیا گیا ہو، لامحالہ کسی سیاسی دانشور، فلسفی یا روحانی شخص کی طرف سے آئے گا۔ اور اس کے ذہن و فکر کی محدودیت اس میں در آئے گی۔ ایسے مذہب عام طور پر کسی نبی کی جزوی تعلیمات اور فکرِ انسانی کی آمیزش سے بنائے جاتے ہیں، لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ایسے مذاہب اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں بالکل ناکام رہتے ہیں۔ صرف سچّے انبیاء کی تعلیمات ہی میں وہ نظریۂ حیات پایا جاتا ہے جو ایک ایسا انسانی معاشرہ ترتیب دے سکے جس میں انسانیت کی بڑی تعداد کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت ہو، اور جو انسانی ارتقاء کے لیے لامحدود رفعتوں کی ضمانت دے سکے۔ اور بالخصوص خاتم الانبیاء کی تعلیمات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے جس میں تمام خطّوں اور طبائع کے انسانوں کے لیے ہدایت ہوتی ہے اور وہ یہ صلاحیت رکھتی ہیں کہ پُوری نوعِ انسانی کو ایک دینِ حق پر جمع کیا جا سکے۔ چونکہ اس دین میں انسانی شخصیّت کے تمام پہلوؤں سے متعلق راہنمائی ہوتی ہے، اس لیے ارتقاء انسانی کی مکمل ضمانت اس میں دی جاتی ہے۔ اس

نبی آخر الزماں سے قبل تمام نبی صرف مخصوص قوموں کی طرف مبعوث کیے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کی نوعیت بھی ایسی نہیں ہوتی کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں۔ گویا ان کی مثال جانوروں کی ان نامکمل طبیعی انواع کی طرح ہے جو حالات کی نامساعدت کی وجہ سے اپنا وجود باقی نہ رکھ سکے اور ناپید ہو گئے۔ خاتم الانبیاء کی تعلیمات کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ اپنے ماقبل انبیاء کی تعلیمات کے بنیادی اور مرکزی تصورات کی جامع ہوتی ہیں۔ چنانچہ انبیاء کو دیئے گئے عملی احکامات یعنی شریعتوں میں تو فرق ہوتا ہے لیکن بنیادی نظری تصورات سب میں یکساں ہوتے ہیں اور نبیِ خاتم کی شریعت اس اعتبار سے جامع اور مکمل ہوتی ہے کہ اس میں تا قیامِ قیامت انسانیت کے جملہ مسائل کا حل موجود ہے اور رہتی دنیا تک تمام لوگ اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۴: ہمیں نبی آخر الزماںؐ ہی کی پیروی کیوں کرنی چاہیئے اور آپؐ ہی کے بتائے ہوئے طریقۂ عبادات کو کیوں اپنانا چاہیئے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اصولی طور پر تمام انبیاء کی بنیادی تعلیمات کی پیروی تو کریں لیکن نماز اور عبادات کی ظاہری شکل میں کسی کا اتباع نہ کریں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ عبادات کا نظام، ان کی شکل اور اوقات ہم اپنی مرضی، حالات اور سہولت کو مدّنظر رکھتے ہوئے مقرر کریں؟

جواب: خالقِ کائنات سے محبّت اور ربط و تعلّق کو استوار کرنے کے لیے نبی کی تعلیمات پر من حیث الکل عمل اور اس پر ایمان ناگزیر ہے۔ ہم بحیثیّتِ فرد اور بحیثیّتِ اجتماع اس وقت تک خود شعوری کا ارتقاء حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہم وقت کے نبی کا کامل اتباع نہیں کرتے۔ نبی پر ایمان اور اس کا کامل اتباع گویا ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص اس کے توسّط سے روحانی بالیدگی کی اعلیٰ ترین سطح حاصل کرے۔ جس طرح ایک گرم شے کو چھُونے سے حرارت دوسری شے میں منتقل ہوتی ہے یا ایک چراغ کی حرارت دوسرے چراغ کو روشن کر دیتی ہے، اسی طرح نبی سے تعلق اس کے متبعین میں ایمانی نور و حرارت منتقل کرتا ہے۔ نبی اپنی روحانی رفعت کا کچھ حصّہ اپنے صحابہ اور صحابہ بعد کے آنے والے لوگوں میں درجہ بدرجہ منتقل کرتے ہیں۔ گویا عشق و محبّت کا نور پہلے ایک نقطہ پر مرتکز ہوتا ہے اور پھر پورے ماحول کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ اور یہ مرکزی نقطہ ہمیشہ کسی نبی کی ذاتِ مبارکہ ہوتی ہے۔

اس حقیقت کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ سلسلۂ نبوّت ایک حیاتیاتی ضرورت ہے جو حیاتیاتی سطح پر جوششِ حیات اپنے انواع کی کثرت، مخالف جنسوں میں کشش اور اختلاط سے حاصل کرتا ہے۔

چنانچہ تمام بنی نوعِ انسان کے افراد ایک ہی انسانی جوڑے کی اولاد ہیں اور یہی سبب ہے کہ وہ سب جسمانی ساخت اور اعضاء کی بناوٹ میں مماثلت رکھتے ہیں۔ جوشِ حیات کے پھیلاؤ کا عمل نفسیاتی سطح پر بھی جاری رہتا ہے اور وہ یوں کہ قافلۂ انسانیت کے کچھ افراد نبوت سے سرفراز کیے گئے ہیں اور لوگ فطری طور پر ان کے طریقے اپنا کر روحانی و نفسیاتی بالیدگی حاصل کرتے ہیں۔ گویا نظریاتی اعتبار سے نبی کی حیثیت اپنے امتیوں کے لیے جدِ امجد کی ہوتی ہے اور وہ سب اس کا اتباع کر کے دین سے رشتہ استوار کرتے ہیں۔ معاشرت، قانون اور اخلاق میں ایک جیسے قوانین پر عمل کر کے ان سب میں ایک وحدت کا احساس پیدا ہونا فطری ہے۔ جس طرح ایک نامیاتی خلیہ دوسرے نامیاتی خلیے کو جنم دیتا ہے، اسی طرح نظریاتی عالم میں ایک نبی کی دعوت دوسرے نبی کی تعلیم و دعوت کی بنیاد بنی تا آنکہ اس سلسلہ کے اختتام پر نبی آخر الزماںؐ کی دنیا میں آمد ہوئی۔

جو شخص مکمل طور پر اور غیر مشروط طور پر نبی پر ایمان لا کر اس کا اتباع کرتا ہے، وہ گویا ایک طرح سے نئی زندگی کا آغاز کر کے نفسیاتی اور نظریاتی اعتبار سے ترقی و کمال کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اس شخص کی مثال اس جنین کی سی ہے جو ایک دَور میں مکمل طور پر اپنی ماں پر انحصار کرتا ہے اور پھر اپنی جداگانہ زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ پھر جس طرح بچّہ آغاز میں اپنی ماں کے دُودھ سے غذا حاصل کرتا ہے، اسی طرح ایک صاحبِ ایمان و یقین نبی کے کامل و اکمل اسوہ پر عمل کر کے اور اس کے علم و عرفان سے استفادہ کرتے ہوتے اپنے روحانی سفر کا آغاز کرتا ہے۔ نبی کے بتائے ہوئے اوامر و نواہی پر وہ مسلسل عمل جاری رکھتا ہے حتیٰ کہ وہ اسے خارج سے ٹھونسے ہوئے احکام نہیں بلکہ خود اپنے دل کی آواز اور فطرت کا تقاضا محسوس ہونے لگتے ہیں اور نبی کا بتایا ہوا خیر و شر کا فرق اسے اپنے باطن سے اُبھرتا معلوم ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو حاصل کر لینے کے بعد نبی کی اطاعت اسے چنداں گراں نہیں گزرتی بلکہ اس کے دل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شدید محبّت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ روحانی ارتقاء کے اس مرحلے پر وہ اپنے کردار و اعمال اور شب و روز کے معمولات میں نبی اکرمؐ سے اسی طرح کی کامل مشابہت اختیار کر لیتا ہے جیسی ایک باپ اور بیٹے کے مابین ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر نبی کے مخلص اور حقیقی متبعین اس کی نظریاتی اولاد کی مانند ہوتے ہیں۔

فطری نظریۂ حیات (دینِ اسلام) کے مناسکِ عبادت اور مذہبی اداروں میں تبدیلی نہیں ہوتی!

وہ مناسکِ عبادت اور مذہبی ادارے جو کسی فطری نظریۂ حیات سے متعلق ہوتے ہیں، تبدیلی یا ردّوبدل کے عمل سے نہیں گزرتے۔ ارتقائی عمل کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنی اصلی شکل ہی میں برقرار رہیں۔ جس طرح حیوانات کی ایک نوع بعض ایسے نسلی مادّی امتیازات رکھتی ہے جو اسے دوسری انواع سے ممتاز کرتے ہیں بعینہٖ اسی طرح ایک فطری نظریاتی اجتماعیت (جو فطری یعنی نبوّت کی عطا کردہ تعلیمات کی پیروی کرتی ہے) کے بھی مخصوص اوصاف ہوتے ہیں جو اسے دوسری اجتماعیتوں اور گروہوں سے جدا کرتے ہیں۔ ان نظریاتی اوصاف کا تعلّق اُن عبادات کے طریقوں اور مذہبی معاملات سے ہے جو رسول اور اس کے فوراً بعد اس کے متّبعین اپناتے ہیں۔ جس طرح حیوانات کی کوئی نوع اپنے مخصوص کوائف کو کسی بنیادی نوعی تبدیلی کے بغیر تبدیل نہیں کرسکتی اسی طرح کوئی نظریاتی کمیونٹی کسی دوسری نظریاتی کمیونٹی میں تبدیل ہوئے بغیر اپنے بنیادی نظریاتی اوصاف میں ردّوبدل گوارا نہیں کرتی۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں جہاں تک نوعی فرق کا تعلق ہے کوئی نوع اپنے مخصوص جسمانی اوصاف اُسی وقت ترک کرتی ہے جب اس کا شعور ایک زقند لگا کر دوسرے نوعی اوصاف اپناتا ہے اور اس طرح بالکل نئی حیوانی نوع معرضِ وجود میں آتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کے صفحۂ ہستی پر ظہور کے بعد ارتقاء کا یہ طریقہ ختم ہوچکا۔ اب کائنات کے اختتام تک انسان اپنی موجودہ جسمانی وضع قطع اور اوصاف کے ساتھ موجود رہے گا اور کوئی اعلیٰ نوع اسے ختم نہ کرے گی۔ یہی معاملہ نظریاتی ارتقاء کی صورت میں بھی ہے۔ نظریاتی ارتقاء گزشتہ تمام نبیوں کی بعثت تک ہوتا رہا، لیکن پیغمبر آخر الزمان کی بعثت کے ذریعے دنیا میں آخری نظریۂ حیات اور آخری نظریاتی کمیونٹی معرضِ وجود میں آئے۔ اور اب اِس نظریۂ حیات کے مخصوص مناسکِ عبادات اور مذہبی احکام رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ یہ بذاتِ خود انسان کے فکری ارتقاء میں کبھی بھی رکاوٹ کا باعث نہ ہوں گے بلکہ ہمیشہ انسان کی ترقی اور ذہنی و فکری بالیدگی کی ضمانت دیں گے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ ان کا تعلّق کائنات کے تخلیقی ارادے یعنی مشیّتِ

ایزدی سے ہے۔

خودشعوری کی اعلیٰ معراج صرف خاتم الانبیاء کی اُمت کے لیے ہے!

چونکہ صرف خاتم الانبیاء کی تعلیمات ہی جامع ہیں اس لیے صرف وہ ہی پوری نوع انسانی کو ایک فکری وحدت میں سموکر انہیں خودشعوری کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچاسکتی ہیں حیوانی سطح پر ارتقائی عمل نے صرف ایک جہت اختیار کی تھی یعنی حیات کے لیے جسمانی طور پر زیادہ موافق انواع کی صورت گری۔ انسان کے ظہور کے بعد اب اہمیت افکار کی ہے اور اس ضمن میں نبیٔ آخرالزماں کی تعلیمات رہتی دنیا تک ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

جیساکہ قبل ازیں کہا جاچکا ہے ارتقاء کے عمل میں صرف تخلیق شدہ انواع کی مساعی ہی کو دخل نہیں ہوتا بلکہ اس میں کائنات میں پوشیدہ اُن قوتوں کی بھی اہمیّت ہے جو خالقِ کائنات نے اس میں رکھ دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام حیواناتی انواع کوشش کے باوجود انسانی شکل میں اپنا ارتقاء حاصل نہ کرسکیں۔ اسی کا مظہر انسانی سطح پر یوں ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے انسانی تمدّن جو پیغمبرِ آخرالزمان کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے، اپنے طور پر اور اپنے تصوّر کے مطابق عبادت کے اطوار اور اخلاقی اعمال اپناتے ہیں، تاہم ربِّ کائنات اُن کی اِن مساعی کو شرفِ قبول نہ بخشے گا اور اس وقت تک ان کے فکری ارتقاء کا سامان نہ ہو گا جب تک وہ اپنا دامن خاتم الانبیاء کی دعوت سے وابستہ کر کے اس کی کامل اطاعت نہیں کرتے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی صرف وہی انسانی تمدّن فکری وتہذیبی ارتقاء حاصل کر سکے تھے جنہوں نے انبیاء کی تعلیمات پر ایمان لاکر ان پر عمل کیا تھا۔ یہی تعلیمات جامعیت کے ساتھ انسانی ارتقاء اور نمو کی ضمانت دے سکتی تھیں۔

دینِ فطرت تاقیامت اپنی اصلی حالت پر برقرار رہے گا۔

سطور بالا سے اس حقیقت کی وضاحت بتمام وکمال ہوجاتی ہے کہ دینِ فطرت یعنی اسلام کی

بنیادی تعلیمات بعینہٖ انہی خطوط کے مطابق جاری رہیں گی جن پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں استوار کیا تھا چاہے کچھ لوگ اس میں تبدیلی یا کتر بیونت کی کتنی ہی کوششیں کریں۔ ان کی یہ مساعی ہر اعتبار سے بے سُود رہیں گی، چاہے وقتی طور پر ان کی موشگافیاں معدودے چند لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیں۔ اس کا سبب دینِ متین کی تعلیمات کا عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہونا ہے۔ کوئی بھی مذہب اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اس کے معتقدین فکری بدعات اور تحریفات کے خلاف پوری قوّت سے جمے رہتے ہیں۔ دین یہ گوارا کر لیتا ہے کہ اسے ترک کر دیا جائے لیکن یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ اس میں انسانی افکار کو خلط ملط کر دیا جائے۔ انسانی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ دین جو اُس کے ذوقِ حسن کو کامل تسکین بخشتا ہے، ہر قسم کے ردّ و بدل سے بالاتر رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہی افرادِ انسانی اپنے کمالِ ارتقا تک پہنچتے ہیں جو کسی دین کو قبول کر کے اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حاوی کرتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کا یہی خاصّہ ہے جو دین اسلام کو تا قیامِ قیامت باقی رکھے گا اور صرف اس کے عقائد اور تعلیمات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ پوری انسانیت کو ایک وحدت میں متحد کر سکیں۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ تمام انبیاء کی عمومی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر انفرادی و اجتماعی طور پر کامیابی حاصل کر سکتا ہے، تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو جنّت الحمقاء میں رہ رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس طور پر کسی بھی نبی کی تعلیمات پر عمل نہ کر سکے گا۔ اس صورت میں فیصلہ کن عامل ہر شخص کا اپنا انتخاب اور اپنی رائے ہوگی، اور ہر شخص اپنی مرضی سے انبیاء کی تعلیمات میں چھان پھٹک کر سکے گا۔ اس حکمتِ عملی سے سوائے اس کے کچھ حاصل نہ ہوگا کہ ہر شخص اپنی پسند کے مطابق مذہب کا ایک ایڈیشن تیار کرے اور اس طرح دنیا میں بے شمار متصادم و مخالف مذاہب معرضِ وجود میں آجائیں گے۔ یہ سوچ رکھنے والے افراد کبھی بھی ایک ہم خیال اور متحد ملت کی شکل اختیار نہیں کر سکتے ـــــ وہ متحد ملت جو صرف صحیح نصب العین (یعنی خدائے واحد اور خاتم الانبیاء) سے ربط و تعلق کی بنیاد پر قائم کی جا سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر وحدتِ ادیان کے حامی کبھی بھی اپنے فکر کی بنیاد پر "صحیح نصب العین" کو سیاسی طور پر حقیقت کا روپ نہیں دے سکتے۔ اور یہ چیز بجائے خود ان کی کج فکری کی دلیل ہے۔ ایسے لوگ

کبھی بھی اپنے تراشیدہ مذہب کی بنیاد پر پوری انسانیت کو متحد کر کے ایک عالمی ریاست کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں سیاسی اور نیم سیاسی مساعی بھی قطعاً مفید نہ ہوں گی اور نہ ہی وہ ان اہداف کا بدل بن سکیں گی جن کے لیے مذہب کو فی الواقع اپنایا جاتا ہے۔

اخلاقیات کے لیے خالقِ کائنات سے محبّت شرط لازم ہے اور اس محبّت کا عملی تقاضا یہ ہے کہ وقت کے نبی کا اتّباع کیا جائے۔ فطرتِ انسانی اور خود مختلف انبیاء کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ یہی ہے۔ اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں دیگر تمام اصول غیر مؤثّر ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ عالمی اخلاقی تحریک جس میں بلاشبہ تمام اقوام کے سرکردہ اور علمی افراد (مرد اور خواتین دونوں) حصّہ لے رہے ہیں، اسی حقیقت سے محجوب ہیں۔ ان پر نبی کی تعلیمات پر ایمان لانے کی اہمیّت واضح نہیں ہے۔ چنانچہ یہ تحریک عالمی سطح پر اخلاق کے میدان میں ترقی و ترفّع یا اخلاقیات کے عالمی احیائے ثانی میں قطعاً ناکام رہے گی۔

سوال نمبر ۵: اگر یہ مان لیا جائے کہ سلسلۂ نبوّت بالآخر منقطع ہونا ہے، تو پھر ہم حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی آخری نبی کیوں تسلیم کریں؟ کیا حضرت عیسیٰؑ آخری نبی نہیں ہو سکتے؟

جواب: کامل ترین اور ہر اعتبار سے تسلّی بخش نظریۂ حیات وہ ہے جو اسلام ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں جنہوں نے صحیح نصب العین پر مبنی ایک کامل نظریۂ حیات پوری دنیا کو عطا کیا۔ یہ نظریۂ حیات اس اعتبار سے جامع ترین ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے تمام گوشوں یعنی سیاست معیشت، اخلاق، قانون، سماج اور بین الاقوامی تعلقات سب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ تمام برحق انبیاء کی تعلیمات صحیح نصب العین سے محبّت و تعلق پر استوار تھیں لیکن صرف خاتم الانبیاء حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں ہمیں دینی تعلیمات زندگی کے تمام گوشوں میں عملی صورت میں نمایاں ہو کر نظر آتی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے انسانی تمدّن میں عملی اور اخلاقی اعتبار سے ابھی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ کوئی نبی ہمیشہ کے لیے اجتماعیاتِ انسانی کے لیے راہنما اصول فراہم کر دیتا۔ چنانچہ خاتم الانبیاء حضرت محمّد صلی اللہ

علیہ وسلم سے قبل تمام انبیاء کی تعلیمات اس اعتبار سے نامکمل تھیں اور ہمیں صرف آپؐ ہی کو سلسلۂ نبوّت کی آخری کڑی تسلیم کرنا ہوگا۔ آپؐ سے پہلے تمام انبیاء مخصوص امتوں کی طرف اور متعین وقت کے لیے بھیجے گئے۔ ان میں کسی کی تعلیمات بھی پوری انسانیت کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نہ تھیں۔

آنحضورؐ کا اُسوہ ــــ کامل ترین نمونہ

نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف متاہّل زندگی بسر کی، بلکہ آپؐ نے مومنین صادقین کی اعلیٰ ترین تربیت کر کے کفر و الحاد کا پُوری شدّت اور سرفروشی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اسلامی ریاست کی نہ صرف داغ بیل ڈالی، بلکہ اس کی سربراہی اور انتظام و انصرام کی ذمّہ داریاں بھی ادا کیں، بیرونی دشمنوں اور خطرات سے اس کا دفاع کیا اور اس کے داخلی استحکام کے لیے تمام تدابیر اختیار کیں۔ اسلام کے اصُولوں پر مبنی معیشت، معاشرت اور قانون کو عملی شکل دی اور اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کے خدوخال بھی واضح کیے۔ ہر نصب العینی تحریک کی طرح اسلام کے شیدائیوں نے بھی اس کے پھیلاؤ اور پوری دنیا میں اس کے نفوذ کے لیے انتھک مساعی کیں، اور خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں اس عمل کا آغاز فرما دیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کسی نبی نے اپنی عملی مثال سے دین کے تحفّظ اور عالمی استحکام و پھیلاؤ کے لیے اس طرح کی مثال پیش نہیں کی۔

کوئی بھی نظریۂ حیات اپنے آپ کو اسی طرح مشکلات اور موانع سے بچاتا ہے اور اپنا دفاع کرتا ہے جس طرح ایک نامیاتی جسم اپنے آپ کو حالات کی ناسا عدت کے باوجود قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی انتہائی اہم عضو معطّل ہو جائے یا گل سڑ جائے، تو اس صورت میں اگرچہ پُورا جسم متاثر ہوتا ہے، لیکن اس سے کمتر صورت میں جسم تمام اہم اعضاء کی صحت کے ساتھ اپنے آپ کو برقرار رکھتا ہے چاہے کم وقعت کے اعضاء میں کتنی ہی خرابی کیوں نہ ہو جائے۔ اعضائے رئیسہ کی کارکردگی مختلف خرابیوں کا تدارک کر کے پُورے جسم کی صحت اور زندگی کے

اِحیاء و بقا کا انتظام کرتی ہے۔ بالکل ایسی ہی مثال اس نظریۂ حیات کی ہے جس میں زندگی کے اہم گوشوں کے بارے میں ہدایات نہیں ہوتیں۔ اس نظریۂ حیات کے ماننے والے جوں جوں حیاتِ انسانی کی پیچیدگیوں سے واقف ہوتے ہیں، انہیں یہ احساس دامن گیر ہوجاتا ہے کہ ان کے نظریۂ حیات (یا مذہب) میں خامیاں ہیں اور وہ زندگی کے اہم شعبوں میں ان کی راہنمائی سے نہ صرف قاصر ہے بلکہ وہ ان کے فکری و تمدّنی ارتقاء میں رکاوٹ بھی ہے۔ ایک ایسا نظریۂ حیات جو آغاز ہی سے اپنی تعلیمات میں نامکمل ہو، ظاہر ہے کہ بعد والوں کی فکری مساعی سے بھی اس قابل نہیں ہوسکتا کہ وہ تمام مسائل کا تسلی بخش حل پیش کرسکے۔ اندریں صورت اس کے لیے یہ ناگزیر ہوجاتا ہے کہ مختلف افراد کی طرف سے پیش کردہ افکار کو اپنے اندر جذب کرکے خود حق اور ناحق کا عجیب و غریب ملغوبہ بن جائے۔ اور جب باطل اور حق کا اس طرح انمل بے جوڑ امتزاج ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ حق اپنی افادیت پورے طور پر کھو کر باطل سے علیحدہ کچھ نہیں رہتا۔ حق اُس وقت تک ہی حق رہتا ہے جب تک باطل کی آمیزش سے بالکلّیہ پاک رہے۔

عیسائیت کی مثال

مذہبِ عیسائیت کی صورت بالکل وہ ہوئی جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہے۔ اس مذہب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ سیاسیات کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ نہ اس کے اصولوں اور نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے ریاستی معاملات کے بارے میں کوئی ہدایات ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب جدید دَور میں عیسائی ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں تو انہیں کچھ علم نہ تھا کہ وہ مذہبی معتقدات اور ریاستی معاملات کو باہم دگر کس طرح مربوط کریں۔ مذہب اور مملکت کے مابین شروع میں طویل اور سخت کشاکش جاری رہی تا آنکہ مذہبی علماء نے بامرِ مجبوری یہ فیصلہ کیا کہ مذہب اور ریاست دونوں الگ الگ ہیں اور ان میں کوئی ربط و تعلّق نہیں۔ یہ بجائے خود ایک غلط نقطۂ نظر تھا جو عیسائیت کی محدود تعلیمات کی بنا پر غلط نصب العین کی خاطر اختیار کیا گیا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ عیسائیت کی بعض اقدار بالکل صحیح تھیں اور ان کا تعلق یقیناً انسانی

زندگی میں بہتر ارتقائی عمل سے تھا لیکن ریاست وحکومت کے بارے میں تعلیمات نہ دے کر عیسائیت نے ثابت کر دیا کہ وہ بعد میں ظہور پذیر ہونے والے انسانی تمدنوں کے لیے ناقابل عمل ہے جب ایک بار عیسائی علماء نے مذہب کو ریاست سے جدا کر دیا تو اس کا اثر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ وہ بالآخر اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں یعنی اقتصادیات، معیشت، تعلیم، دفاع، قانون، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ سے خارج کر دیا گیا۔ نتیجتاً مغرب میں عیسائی مذہب کا اثر انفرادی واجتماعی زندگی پر بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔ اور مذہب کے تصوّرِ خدا کے بجائے لوگوں کے افکار اور مساعی کا محور نسلی یا علاقائی قوم پرستی بن گیا۔ مذہب کا تعلّق صرف عبادت اور کلیسا سے رہ گیا اور عمل کی دنیا میں مؤثر قوتیں بالکل مادی اور دنیاوی قسم کی ہو گئیں۔ الغرض آج کی دنیا میں عیسائیت اپنے متبعین کی زندگیوں میں ایک مؤثر عامل کے طور پر قطعاً موجود نہیں ہے۔

لاریب حضرت عیسیٰؑ سچے نبی تھے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ صحیح نصب العین کے صرف ایک پہلو (اخلاقی وروحانی پہلو) کو انسانیت کے محض ایک چھوٹے سے حصّے یعنی بنی اسرائیل کے لیے اجاگر کرنے آتے تھے۔ مزید برآں آپؑ کی تعلیمات ایک محدود عرصے کے لیے تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا تعلّق اجتماعی زندگی کے سیاسی پہلوؤں سے متعلق تھا ہی نہیں اور نہ ہی آپؑ نے اپنے عمل سے اس طرح کی کوئی راہنمائی فراہم کی۔ مشیتِ ایزدی کے مطابق یہ تعلیمات ایک مناسب وقت پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری انسانیت کی راہنمائی کے لیے دینا تھیں۔ چنانچہ انگریز پادری مارٹن ڈی۔ آر سی بالکل بجا طور پر اپنی تصنیف "کیمونزم اور عیسائیت" میں رقمطراز ہے:

> "اس حقیقت کا اعادہ بار بار کیا جانا چاہیے کہ عیسائی مذہب کی تاسیس اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی خاص قوم کو خوشحالی حاصل کرنے کے طریقے بتائے۔ یہ فکر دراصل یہودیوں کی غلطی تھی، اور جب لوگوں نے مسیح کو بادشاہ بنانا چاہا تو وہ ان سے بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے"

ماضی قریب میں ایران میں رونما ہونے والا مذہب بہائیت ایسے ہی نامکمل مذہب کی ایک اور مثال ہے۔ چونکہ یہ بھی سیاست اور جنگ وامن کے قوانین سے بحث نہیں کرتا، اس

لیے اپنی بنیاد پر کسی ایسے ریاستی اور اجتماعی نظام کو قائم نہیں کر سکتا جو دوسرے مذاہب سے کلیتہً آزاد ہو یہی وجہ ہے کہ بہائیت دنیا میں زیادہ عرصے تک چلنے والا مذہبی نظریہ حیات نہیں ہے۔ بہائیت کا اصل الاصول دنیا میں امن کا قیام اور انسانوں کو متحد کرنا ہے لیکن اس مذہب کو پیش کرنے والے یہ بھول گئے کہ اکثر اوقات امن کے قیام کے لیے جنگ ضروری ہوتی ہے اور مستقبل میں انسانی اتحاد اس بات کا متقاضی ہوگا کہ وہ اپنے داخلی نظم کو قائم رکھنے کے لیے مخالف قوتوں سے سختی سے نبٹے۔ اور یہ کہ لوگوں کو جدید ریاستوں کے نظام میں رہنا ہوگا جس کے لیے انہیں ہدایات و قوانین کی ضرورت ہوگی۔ سیاسی جدّوجہد کی نفی اور مختلف نظاموں کے تحت منفعل انداز میں زندگی بسر کرتے ہوئے اگر وہ بہائی ریاست کے قیام کا خواب دیکھتے ہیں تو یہ سراسر ان کی خام خیالی ہے۔ اگر کسی نظریہ حیات کے آغاز ہی میں زندگی کے کسی اہم شعبے سے متعلق ہدایات نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ بعد میں آنے والے معتقدین بھی اس کمی کی تلافی نہیں کر سکتے۔ وہ لامحالہ اس نظریہ حیات کے بانی کی زندگی کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتے ہیں اور اگر انہیں وہاں کوئی روشنی نہ ملے تو زندگی کا وہ گوشہ بنیادی مذہبی تعلیمات سے خالی رہتا ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی مذہب زیادہ لمبے عرصے تک باقی نہیں رہ سکتا۔ مزید برآں بہائی مذہب کا یہ عقیدہ کہ سلسلۂ نبوّت جاری ہے اور ہر ہزار سال کے بعد ایک نیا روحانی لیڈر نئی مذہبی جماعت کی تاسیس کرے گا، ان کے اپنے دوسرے عقیدے سے متصادم ہے کہ بہائیت ہمیشہ کے لیے پوری انسانیت کو ایک وحدت میں پرو دے گی۔ بنیادی عقائد میں اس طرح کا تضاد قبول کرنا عقلی طور پر محال ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے تمام مذاہب اور نظریہ ہائے حیات بہت جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔

اسلام کی مطابقت پذیری (اجتہاد)

جب کسی نظریہ حیات کی صورت یہ ہو کہ وہ ایک متعین نصب العین سے آغاز کر کے حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں مثلاً سیاست معیشت، قانون، جنگ و صلح وغیرہ کا احاطہ کر سکے تو خود اس کی بقاء کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ یہ صورت بدرجۂ اتم اسلام میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ بادی النّظر میں کبھی کبھی

یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اسلام حیاتِ دنیوی کے بعض پہلوؤں کے ضمن میں تفصیلی احکامات نہیں دیتا، لیکن اس کے باوجود تاریخی حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام ایک دم جاری وساری ہے اور کسی صحت مند نامیاتی وجود کی طرح یہ از خود اپنے مردہ حصوں کی تجدیدِ نو کرتا چلا جاتا ہے۔ اسلام کو اپنے محکمات کے مرکز سے اتنی قوّت حاصل ہوتی رہتی ہے کہ نئی نئی صورتوں میں اپنے متبعین کو ہدایات دے سکے۔ اسلام میں فکرِ نو کی اس صلاحیت کو اجتہاد کی اصطلاح کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

چونکہ اسلام فی الاصل صحیح نصب العین کے حیاتِ انسانی کے جملہ گوشوں پر اطلاق کا دوسرا نام ہے، یہ آج تک زندہ ہے اور رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ اگر کبھی حالات کی نامساعدت اسے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے کسی گوشے سے خارج کر بھی دے، تو یہ بہت جلد اپنے آپ کو غالب کر کے اس گوشے پر دوبارہ حاوی ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک ایسا نامیاتی وجود جو قوّت اور جوشِ حیات سے لبریز ہو، بیماری کے خلاف برسرِ پیکار ہو کر اپنی صحت بحال کر لیتا ہے، بالکل اسی طرح اسلام خارجی اور داخلی ہر قسم کے مخالفانہ عناصر کے خلاف مدافعت کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ اس کے دائرہ اثر میں کوئی مخالفِ دین فکری تحریک پنپ نہیں سکتی۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان جدید دور کے لادینی فکر کے علی الرغم اسلامی دینی ریاست کے قیام کے خواہاں ہیں اور انہوں نے اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی ماضی قریب میں دی ہے اور آئندہ بھی اس کے لیے تیار ہیں۔

اسلامی نظریۂ حیات کے اہم خدوخال

اسلامی نظریۂ حیات کے اہم ترین خدوخال ان اطوارِ عبودیت اور اخلاقی ضابطوں سے متعلق ہیں جو عہدِ رسالت سے مسلمانوں کو منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں وضاحت سے کہا جا چکا ہے، یہ خدوخال ہمیشہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ میں باقی رہنے ضروری ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کے اہم ترین اور بنیادی ارکان یہ ہیں:

(۱): کلمۂ شہادت یعنی یہ گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔

(۲): صلوٰۃ یعنی پنج وقتہ باجماعت نماز کا اہتمام۔

(۳): زکوٰۃ یعنی متعیّن شرح سے فاضل سرمائے کا کچھ حصّہ معاشرے کے غریب اور نادار لوگوں کی اعانت اور فلاح و بہبود میں صرف کرنا۔

(۴): صوم یعنی سال بھر میں ماہِ رمضان کے روزے۔

(۵): حج، یا معیّن اوقات میں بیت اللہ کا حج و زیارات اور منیٰ و عرفات میں مسلمانوں کے عالمی اجتماع میں شرکت۔

مندرجہ بالا پانچ ارکان اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی کی اساس پر اسلامی تہذیب و ثقافت کا قصرِ رفیع تعمیر ہوتا ہے۔ اسلام کی تمام تر خوبصورتی اور شان و شوکت کا انحصار ان ارکان کی پائیداری پر ہے۔ چونکہ ان ارکان اور عقائد کا تعلق انسان کی ابدی اور غیر متبدّل فطرت سے ہے، اس لیے ان میں بوسیدگی اور غیر متعلق ہونے کا عنصر کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ان سے نہ صرف انسانی شخصیّت کو ہمیشہ جلا ملے گا بلکہ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے حیاتِ اجتماعی کے روحانی و اخلاقی ارتقاء کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ مزید برآں مادی اعتبار سے بھی ان کے فوائد بے شمار ہیں۔

اس فکر کی تردید کہ ظواہرِ اسلام کا ابدی اور ضروری حصّہ نہیں ہیں

سطورِ بالا میں سوال نمبر ۴ کے جواب کے ضمن میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ اسلام کا معاملہ دوسرے نظریہ ہائے حیات سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ ان میں ظاہری رسوم و رواج کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں لیکن اسلام میں ظاہری رسوم اور عبادات کی اہمیّت انتہائی زیادہ ہے اور یہ کہنا درست نہیں کہ ہمیں ان کی بجائے صرف اسلام کے بعض آفاقی پہلوؤں یا بنیادی اخلاقی تعلیمات ہی کو اہمیّت دینی چاہیے۔ اسلام میں مناسکِ عبودیت کی بھی اتنی اہمیّت ہے جتنی اخلاقیات کی۔ اس لیے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی شکل کے مطابق جاری رکھنا ضروری ہے۔ تجدّد پسند حضرات کا یہ خیال کہ اسلام میں ظاہری عبادات کی چنداں اہمیت نہیں، متعدّد مغالطوں کی پیداوار ہے۔ ان میں سے ایک مغالطہ یہ ہے کہ فطری نظریہ ہائے حیات کے خارجی خدوخال صرف تبدیل ہوتے ہیں کسی کمال کی جانب ارتقاپذیر نہیں ہوتے۔ دوسرا مغالطہ جس کا یہ لوگ شکار ہوتے ہیں، یہ ہے کہ متعیّن ظاہری و

خارجی اعمال کی کسی فطری نظریۂ حیات کو ضرورت نہیں ہوتی اور ان کی تبدیلی سے اس کی بنیادی و مرکزی تعلیمات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ مغالطے حیاتِ انسانی کے خصائل و اوصاف کے بارے میں غلط نظریہ رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ حیاتیاتی اور نفسیاتی سطح پر جس طرح انسان ارتقا کر رہا ہے وہ خود اس بات کا متقاضی ہے کہ بعض مناسک عبودیت اور خارجی اعمال و رسوم کو مسلسل جاری رکھا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح کسی حیاتیاتی وجود کے لیے خارجی شکل و صورت اور وجود لازمی ہے اسی طرح مذہب یا نظریۂ حیات کے لیے بھی خارجی اعمال اور رسوم ازبس ضروری ہیں جس طرح انسان جسمانی وجود اور رُوح کا مجموعہ ہے، اسی طرح ہر نظریۂ حیات بھی دو عناصر یعنی روحانی و اخلاقی تعلیمات (جو اس کا اصل جوہر ہوتا ہے) اور مخصوص خارجی اعمال و عبادات پر مشتمل ہوتا ہے۔ حیاتیاتی وجود کی طرح کسی نظریۂ حیات کے یہ دونوں عناصر ایک وحدت کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان کی تمام تر فعالیت اور اثر انگیزی اسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

ارتقائی عمل خواہ حیاتیاتی سطح پر ہو یا نفسیاتی سطح پر، دراصل خارجی ظواہر کے ارتقاء کا نام ہے اور ظواہر کے بعض عناصر نفسیاتی اور حیاتیاتی ہر دو سطحوں پر یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ ارتقاء کی حیاتیاتی سطح پر تمام نامیاتی افراد کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے اور وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ فعالیّت کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھ سکیں لیکن اس خواہش کو بدرجۂ اتم صرف انسان ہی حاصل کر سکا۔ بعینہٖ ارتقا کے نفسیاتی سطح پر تمام نظریہ ہائے حیات کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کا مطلوبہ ہدف یا نصب العین زیادہ سے زیادہ متوازن اور حسین ہو لیکن جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، نظریہ ہائے حیات میں سے صرف دین اسلام اس نصب العین کو تمام و کمال حاصل کر سکا ہے۔ متعین اور مستقل خارجی صورت کے بغیر کوئی نظریۂ حیات یا آئیڈیالوجی اتنی ہی بے کیف اور زندگی سے عاری ہو گی جتنی کوئی نامیاتی ہستی بغیر مادی وجود کے ہوتی ہے۔

مکمل ترین آئیڈیالوجی کے تمام اوصاف اسلام میں پائے جاتے ہیں:

اسلام کے بحیثیت پیغمبرانہ نظریۂ حیات چند اور عقائد بھی اہم ہیں جن کی اہمیّت بالخصوص اس وجہ

سے بھی ہے کہ اسلام کو نبی آخر الزّمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر پہلو سے مکمل کر دیا اور یہ آسمانی ہدایت کا آخری ایڈیشن ہے :

(۱) اسلام خالق کائنات کی توحید اور اس کی صمدیت پر بے انتہا زور دیتا ہے۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی شریک یا ساجھی نہیں ہے۔ قرآن وضاحت کے ساتھ یہودیوں اور نصرانیوں کی عقیدۂ توحید میں ملاوٹ اور گمراہیوں کا ذکر کرتا ہے اور یہ کہ کس طرح انھوں نے اس تصوّرِ الٰہ ہی کو مسخ کر ڈالا جو ان کے نبیوں نے پیش کیا تھا۔ مسلمانوں میں آنحضورؐ کے بارے میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ وہ اللہ کی صفات سے متصف ہیں، حالانکہ امّت کے ہر فرد کو آپؐ سے انتہائی محبّت و عقیدت رہی ہے۔ مسلمانوں نے آپؐ کو ہمیشہ ایک بشر اور اللہ کا برگزیدہ بندہ سمجھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید باری تعالیٰ وہ مرکزی اور بنیادی عقیدہ ہے جس سے نصب العینی محبّت کو صحیح رُخ پر پروان چڑھایا جا سکتا ہے اور اس عبادت اور اخلاقی عمل کو صحیح رُوح کے ساتھ انجام دیا جا سکتا ہے جو تخلیقِ انسان کی واحد غرض و غایت ہے۔

(۲) بعض خصوصیات وہ ہیں جو اسلام کے آخری اور مکمّل ترین دین ہونے کی وجہ سے ہمارے سامنے آتی ہیں اور خود قرآن نے ان کو بالصّراحت بیان کیا ہے :

(ا) یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ چنانچہ خود آنحضورؐ کا قول ہے :

لَا نَبِیَّ بَعْدِی (یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا)۔

(ب) آنحضورؐ کی تعلیمات میں گزشتہ تمام نبیوں کی جملہ تعلیمات نقطۂ کمال و عروج تک پہنچی ہیں چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ (المائدۃ : ۳)

(آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تمہارے اُوپر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کر لیا)

(ج) آنحضورؐ کو دی گئی کتابِ ہدایت یعنی قرآن مجید رہتی دنیا تک بلا کم و کاست محفوظ و مامون رہے

گی اور اس کا ذمّہ خود خالقِ کائنات نے لیا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ (الحجر: ۹)

(بے شک اس ذکر کو ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ورودِ مسعود دنیا میں اُس وقت ہوا جب تاریخ کی روشنی پوری آب و تاب سے موجود تھی۔ آپؐ کے صحابہؓ میں تاریخی حقائق سے وابستگی شدید تھی اور بالخصوص ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ تاریخی حقائق کو افسانوی قصص سے ممتاز کرکے تاریخی وقائع کو صحیح پس منظر میں دیکھ سکیں۔ نتیجتاً انہوں نے نہ صرف قرآن کریم کی کماحقّہٗ حفاظت کی، بلکہ آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات، سیرت اور آپؐ کے فرامین کو بھی آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ اگرچہ یہ بھی ہوا ہے کہ بہت سے دشمنانِ دین نے غلط باتیں بھی آنحضورؐ سے منسوب کرکے انہیں عام کر دیا، لیکن مسلمانوں کے اجماع اور خاص طور پر محدّثینِ کرام کی انتھک محنت سے حدیث کی تدوین اور چھان پھٹک میں بڑی مدد ملی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث کی روایت اور پایۂ سند کے اعتبار سے درجے ہیں اور بہت سی روایات کے بارے میں محدّثین نے اعتراض اٹھائے ہیں، لیکن اس سے بحیثیتِ مجموعی حدیث کی ثقاہت پر حرف نہیں آتا بلکہ اس کی اہمیت اور تاریخی استناد کو مزید تقویت ملتی ہے۔ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے حدیثوں کی جانچ پرکھ اور راویوں کے معیار کو متعیّن کرنے کے لیے ایسے ایسے علوم کو ایجاد کیا جن کی مثالیں تاریخِ عالم میں کہیں اور نہیں ملتیں۔

(د) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تاقیامِ قیامت پوری دنیا والوں کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا: ۲۸)

(اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر پوری انسانیت کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!)

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ○ (الانبیاء: ۱۰۷)

(اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر!)

(ھ) آنحضورؐ کا لایا ہوا نظریۂ حیات یعنی دینِ اسلام تمام باطل نظریہ ہائے حیات کو مکمل شکست دے کر عالمی غلبہ حاصل کرے گا۔ چنانچہ از روئے قرآن آنحضورؐ کی بعثت کا مقصدِ وحید دینِ اسلام کا

یہ ہمہ گیر غلبہ و اقتدار ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ (التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصّف: ۹)

(اللہ ہی وہ ہستی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے پورے نظامِ اطاعت پر غالب کر دے)

(و) نبی آخر الزّمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیروکار تمام فطری نظریہ ہائے حیات کے ماننے والوں میں سب سے بہترین امت ہیں اور انہیں پوری انسانیت کی راہنمائی اور ہدایت کی ذمّہ داری سونپی گئی ہے:

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (آل عمران: ۱۰۹)

"تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے اس لیے برپا کیا گیا ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو!"

(ز) نبی آخر الزّماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین ہی مختلف نظریہ ہائے حیات کی کشمکش میں فاتح کی حیثیّت سے اُبھریں گے بفحوائے آیت قرآنی:

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۹)

"تم ہی غالب ہو کر رہو گے اگر تم سچے مومن ہو گئے!"

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (النور: ۵۵)

"وعدہ کر لیا اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسے اُن سے پہلے لوگوں کو عطا کی تھی۔ اور جس دین کو اُس تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے جما کر رہے گا اور ان کے

خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔"

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنافقون: ۸)

"اور عزت (غلبہ) تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے۔"

(ح) ذہن انسانی اور خارجی کائنات کے بارے میں قرآن میں مذکور حقائق سائنسی علوم میں ترقی کے ساتھ ساتھ مزید نکھر کر اور وضاحت کے ساتھ انسانوں کے علم میں آئیں گے، یہاں تک کہ کافر اور ملحد بھی آیاتِ قرآنیہ کا حق و صداقت پر مبنی ہونا تسلیم کر لیں گے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ (حٰمٓ السجدۃ: ۵۳)

"عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق میں (بھی) دکھائیں گے اور خود ان کی جانوں میں (بھی)، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن واقعۃً) برحق ہے۔"

سوال نمبر ۶ ۔ کیا اسلام میں غلام رکھنے کی اجازت ہے؟ اور کیا اسلام تعدّدِ ازدواج کو جائز قرار دیتا ہے؟

جواب: غلامی کا مسئلہ

ہم سب سے پہلے غلاموں کے مسئلے کو لیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی نبی خلا میں اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز نہیں کرتا۔ نہ تو اس کی تعلیمات بالکل تجریدی نوعیت کی ہوتی ہیں اور نہ ہی وہ یہ سمجھتا ہے کہ پہلے سے کوئی سوسائٹی اپنے مخصوص طور طریقوں کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ نبی جس معاشرے میں بھی مبعوث ہوتا ہے، اسے بہرحال اصلاح کا عمل اسی میں شروع کرنا ہوتا ہے اور وہ لامحالہ اس کی خرابیوں کی درجہ بدرجہ تطہیر سے کام شروع کرتا ہے۔ رسول اپنے معاشرے اور سوسائٹی میں پہلے سے پائی جانے والی رسوم اور عوائد کا خیال رکھتا ہے اور ان میں اصلاح کا کام دفعۃً نہیں کرتا بلکہ اس میں ایک فطری تدریج ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس بات کا امکان ہے کہ لوگ اس کی تعلیمات پر قطعاً کان نہ دھریں۔

انسانی فطرت کے تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھنے والے نظریۂ حیات کے اعتبار سے اسلام

(جیسے نبی آخر الزّماںؐ لے کر آئے) انسانی طبیعت اور انسانی سوسائٹی کے بارے میں ارتقاء پسند فکر رکھتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پوری کائنات کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر ارتقائی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق اسلام کا موقف یہ ہے کہ فردِ انسانی اور انسانی معاشرہ میں صرف درجہ بدرجہ اور فطری تدریج جذبات پہلے دِل میں پیدا ہوتے ہیں جن کے زیر اثر اعضاء وجوارح سے درست اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ خارج میں صرف قوانین کی عملداری سے حقیقی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ جوں جوں قلب و ذہن میں خدا کی معرفت اور محبّت جاگزیں ہوتی جاتی ہے، خارجی اعمال خود بخود درست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ذہنی و قلبی تبدیلی کے بغیر کوئی شخص قانون کے جبر کے تحت کوئی عمل کرتا بھی ہے تو وہ حقیقی معنوں میں اچھا اخلاقی و دینی عمل نہ ہوگا۔ اسلام نے فطری تدریج کے اصُول کو بعض دوسری برائیوں کے تدارک کی طرح غلامی کے خاتمے کے سلسلے میں بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اسلام نے اس ضمن میں اسی عرب معاشرے کو اپنے سامنے رکھا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا اور جو سب سے پہلے آپؐ کی دعوت و تبلیغ کا مخاطب بنا۔

مثال کے طور پر اسلام شراب پینے کی بالصراحت ممانعت کرتا ہے اور مندرجہ ذیل آیت میں اس کی حرمت مذکور ہے:

رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ (المائدۃ: ۹۰)

"(یہ سب) گندے شیطانی کام ہیں، پس ان سے باز رہو"

لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس حکم کی آخری تنفیذ مختلف مراحل سے گزر کر ہوئی۔ مثلاً شروع شروع میں شراب کے استعمال کو برقرار رکھا گیا اس شرط یا قید کے ساتھ کہ حالتِ سُکر میں کوئی شخص نماز نہ پڑھے یعنی نماز پڑھنے کے لیے لازمی ہے کہ وہ پورے طور پر ہوش وحواس میں ہو:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ۔

"اے ایمان والو، نزدیک نہ جاؤ نماز کے جبکہ تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ (نشہ اتر جائے اور) تم سمجھنے لگو جو کہتے ہو"

اس ہدایت کا مقصد صاف طور پر یہ تھا کہ مسلمانوں کو رفتہ رفتہ شراب کو کاملتاً چھوڑنے کے لیے تیار

کیا جائے۔ چونکہ ذکر یعنی نماز کی اہمیت ان کے نزدیک شدید تھی اور شراب سے اس کی مغائرت پیدا کر کے مسلمانوں کے ذہنوں میں اس کے استعمال سے بُعد پیدا کرنا مقصود تھا، اس لیے یہ حکم دیا گیا کہ حالتِ نشہ میں نماز کے قریب بھی نہ جائیں۔ بالکل اسی طرح اسلام اس بات کا سخت مخالف ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کے غلام ہوں کیونکہ ان سب کا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور سبھی ایک انسانی جوڑے کی اولاد ہیں، اور یہ کہ اسلام میں کوئی شخص پیدائشی طور پر افضل و برتر نہیں بلکہ شرفِ انسانیت میں سب برابر ہیں اور فضیلت و بزرگی کی بنیاد صرف خدا خوفی اور تقویٰ میں زیادتی ہے۔ کوئی شخص نسل، زبان، یا رنگ کی بنیاد پر کسی دوسرے پر برتری نہیں رکھتا۔ یہ سب چیزیں صرف باہمی تعارف میں معاونت کے لیے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کی نشانیاں ہیں:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْاؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْؕ

(الحجرات: ۱۳)

"اے لوگو، ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور (پھر) تم کو کنبوں اور قبیلوں میں (تقسیم) کر دیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْؕ (الروم: ۲۲)

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا۔"

تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا ہے بلحوائے آیت قرآنی:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰)

یقیناً (تمام) مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھائی دوسرے بھائی کا غلام اور کوئی کسی کا آقا نہیں ہو سکتا یعنی اس آیت سے غلامی کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ مزید برآں غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینے کو بہت بڑی

نیکی کا کام قرار دیا گیا ہے۔ اس عمل کو انفاق فی سبیل اللہ کی طرح نہ صرف ایمان وتقویٰ کی ناگزیر شرط قرار دیا گیا ہے بلکہ ان لوگوں کا شیوہ بتایا گیا ہے جو جنّت میں داخل ہوں گے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ○ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ○ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ○ (البلد: ۱۱ تا ۱۸)

"مگر وہ اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور نہ کر سکا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا، یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر (اس کے علاوہ یہ کہ) آدمی اُن لوگوں (کے زمرے) میں ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ یہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے۔"

دوسری جانب قرآن میں یہ صراحت موجود ہے کہ جو کوئی اس کے جملہ احکامات کو (بشمول اس حکم کے کہ غلاموں کو آزاد کیا جائے۔) درخورِ اعتناء نہیں سمجھے گا وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ چنانچہ اگلی ہی دو آیاتِ کریمہ یہ ہیں: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ○ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ○ (البلد: ۱۹-۲۰)

"اور جن لوگوں نے ہماری آیات (کو ماننے) سے انکار کیا وہ ہیں کمبختی والے۔ ان پر (دوزخ کی) آگ (ڈھانک کر) بند کر دی جائے گی۔"

تاہم اللہ تعالیٰ نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ غلامی کو یک لخت ختم کر دینا شاید اُس معاشرے میں ممکن نہ تھا اور ویسے بھی اس سے بے شمار معاشی اور سماجی مسائل پیدا ہو جاتے۔ چنانچہ قرآن نے اس میں تدریج سے کام لیا اور مسلمانوں میں رفتہ رفتہ وہ اخلاقی حس بیدار کی جس کی وجہ سے اہلِ ایمان نے از خود نیکی کے حصول کے لیے اپنے غلاموں کو آزاد کیا اور اس تعلیم کو خارج سے جبر کے ساتھ عمل کروانے والی تعلیم نہ سمجھا۔ چنانچہ جب تک کسی مسلمان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے غلام آزاد کر سکے، اس کے لیے یہ تاکید تھی کہ وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے، یہاں تک کہ مالک و غلام میں کوئی فرق نہ رہے۔ چنانچہ

قرآنی احکام کا مقصد نہ صرف غلامی کے ادارے کی خرابیوں کا رفتہ رفتہ تدارک تھا بلکہ مسلمانوں میں اس مثبت جذبے کا پیدا کرنا بھی تھا جس کے تحت وہ اپنی مرضی سے غلاموں کو آزاد کر دیں۔ اسی حکمت کے تحت مسلمانوں کو مکاتبت کے اصول کو اپنانے کا بھی حکم دیا گیا۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن اور سنّتِ رسولؐ دونوں سے نئے غلاموں کی خرید و فروخت کا قطعاً کوئی جواز نہیں نکالا جا سکتا۔ جب کہ متعدد حوالوں سے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب کثرت سے ملتی ہے۔

اپنی جگہ یہ حقیقت تاریخی طور پر ناقابلِ تردید ہے کہ اسلام کی تعلیمات نے نئے غلامی کے ادارے کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ اس امر کا اعتراف غیر مسلم بھی کرتے ہیں کہ جہاں جہاں اسلام گیا وہاں سے غلامی کی لعنت ختم ہو گئی۔ لندن کے اخبار "ٹائمز" (۱۴ر نومبر ۱۸۸۷ء) میں شائع شدہ سر جوزف تھامسن کے خط کا مندرجہ ذیل حصّہ اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے:

> "مشرقی و سطی افریقہ میں طویل ترین قیام اور مشاہدے کے بعد میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ اگر اس علاقے میں غلاموں کی خرید و فروخت زوروں پر ہے تو اس کی وجہ وہاں اسلام کا نہ پہنچنا ہے۔ وہاں اسلام کی اشاعت و ترویج سے یقیناً غلاموں کی تجارت میں خاطر خواہ کمی واقع ہوتی۔"

ضمیمہ

تعزیتی شذرہ
بر وفات ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم

شائع شدہ: ماہنامہ 'میثاق'، دسمبر ۱۹۶۹ء

ازقلم: ڈاکٹر اسرار احمد

جناب ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور کی موت عام حالات میں بھی واقع ہوتی تو کم غم انگیز نہ ہوتی۔ لیکن اب جس صورت میں یہ حادثہ فاجعہ پیش آیا ہے اس نے تو واقعتاً سب کے دل ہلا کر رکھ دیئے ---- اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے اور ان کی روح کو اعلیٰ عِلّیّین میں جگہ دے ---- اور ان کے جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے! (آمین)

راقم نے آج سے تقریباً پندرہ سال قبل ڈاکٹر صاحب کی تصنیف "قرآن اور علمِ جدید" پڑھی تھی اور اُسی وقت سے ایک حسنِ ظن ان کی ذات کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔ انہی دنوں جب ان کے ایک عزیز سے' جو گورنمنٹ کالج منٹگمری میں لائبریرین تھے' یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نہ صرف صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں بلکہ ذکرِ صبح گاہی کے لذت آشنا بھی ہیں تو ان کی ذات سے ایک باقاعدہ غائبانہ عقیدت کا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں کراچی میں ڈاکٹر صاحب سے ایک دوبار ملاقات بھی ہوئی --- تاہم ان سے راقم کے براہِ راست روابط کی عمر دو ڈھائی سال سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مناسبتِ طبع اور وحدتِ فکر کی وجہ سے اس مختصر مدت میں بھی نہایت قریبی تعلقات پیدا ہو گئے تھے جن کا ایک مظہر "میثاق" کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا مستقل قلمی تعاون تھا (اگرچہ اس پر ڈاکٹر

صاحب کو اپنے بعض احباب کی ناخوشی کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا)---ذاتی طور پر بھی راقم پر ڈاکٹر صاحب کی شفقتیں اور عنایتیں روز افزوں تھیں۔ چنانچہ اس حادثہ فاجعہ پر بہت سے احباب نے بالکل بجا طور پر راقم کو تعزیت کا حقدار گردانا---فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحسَنَ الجَزاء۔

ڈاکٹر صاحب کی علمی حیثیت کے بارے میں راقم کا کچھ عرض کرنا اپنی حدود سے تجاوز ہے---پائیدار علمی کاموں کی قدر بالعموم دیر ہی سے ہوتی ہے۔ خصوصاً ہمارے یہاں تو زندگی میں قبولِ عام صرف صحافی قسم کے مصنفین کو حاصل ہوتا ہے۔ تاہم زمانہ بہترین منصف ہے اور بقا و دوام صرف پائیدار اور باوقار علمی تصانیف ہی کو حاصل ہوتے ہیں اور انشاء اللہ زمانہ جلد ہی ڈاکٹر صاحب کے علمی مقام و مرتبے کو پہچان لے گا--- تاہم راقم کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی اصل قدر و قیمت اور وقعت و عظمت اس اعتبار سے تھی کہ وہ ایک سچے خدا پرست اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور محبتِ خداوندی ان کے پورے وجود میں سرایت کئے ہوئے تھی---اور خصوصاً اس اعتبار سے ان کے دل و دماغ میں ایسی کامل ہم آہنگی پائی جاتی تھی کہ یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ ان کا دل زیادہ مسلمان ہے یا دماغ-----!!اور یہی چیز ہے جو اس دور میں بالکل عنقا ہے۔ اس لئے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی علم اور ایمان کے خزانے علیحدہ علیحدہ تو مل جاتے ہیں' یک جا نظر نہیں آتے---!!

سچی خدا پرستی کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے ایک نہایت گہرا اور نمایاں اثر ہر مخاطَب پر اس بات کا پڑتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اسلام کے شاندار مستقبل پر پختہ اور غیر متزلزل یقین رکھتے تھے----اور اگرچہ پچھلے دنوں بعض ملکی حالات سے وہ بہت مضطرب رہے حتیٰ کہ وقتی طور پر دل برداشتہ سے بھی رہے' تاہم ان کے اس یقین میں ہرگز کوئی کمی نہیں آئی کہ مستقبل کی عالمگیر ریاست اسلام کی عطا کردہ سچی خدا پرستی کی بنیاد پر ہی قائم ہوگی۔

اور راقم کی رائے میں یہی ڈاکٹر صاحب کے پورے فکر کے وہ دو مرکزی خیال ہیں جن کے گرد ان کی تمام تصانیف کا تانا بانا قائم ہے -----یعنی ایک یہ کہ انسان کا صحیح نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے

محبتِ خداوندی' اور دوسرے یہ کہ نوعِ انسانی جس سمت میں سفر کر رہی ہے اس کی بھی بس ایک ہی ممکن منزل ہے اور وہ ہے اسلام!!!

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی آخری تصنیف "حکمتِ اقبال" کا "انتساب" اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ اس میں انہوں نے اپنا پورا فکر سمو کر رکھ دیا ہے۔ یعنی :

"اُن عاشقانِ جمالِ ذات کے نام جو مستقبل کی اُس ناگزیر عالمی ریاست کا آغاز کریں گے جو اسلام کی اس حکیمانہ توجیہہ پر قائم ہو گی جس کا نام فلسفۂ خودی ہے!"

راقم کے نزدیک "عاشقِ جمالِ ذات" کا جامہ اِس دور کے معروف پڑھے لکھے لوگوں میں سب سے زیادہ جس پر راست آتا تھا وہ خود ان ہی کی ذات تھی اور ان کی وفات سے محبتِ خداوندی کی محفل کی ایک روشن شمع گُل ہو گئی --- يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ' ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' فَادْخُلِىْ فِىْ عِبَادِىْ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ----!!

ایک بات کا خیال البتہ آتا ہے کہ اتنی عظیم ہستی اور ایسی مرگِ ناگہاں' بلکہ کسمپرسی کی موت!! ماتم کی جا ہے کہ ہمارے یہاں بلیک مارکیٹئے اور سمگلر لمبی لمبی کاروں میں پھرتے ہوں اور ایسے ایسے صاحب کمال لوگ اس طرح رکشاؤں میں سفر کریں اور ہر طرح کے خطرات کی عین زد میں رہیں۔ بقولِ ذوقؔ ؎

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے!!

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کا اپنے "عاشقوں" کے ساتھ کوئی خاص ہی معاملہ ہے اور ع

"شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے!"

کے مصداق یہ شمع اب پروانوں کی دلسوزی ہی کی سودائی نہیں بلکہ ان کی کامل شکستگی کی طالب ہے ع

"کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!"

اور "عاشقانِ جمالِ ذات" سے تو شاید "بخاک و خون غلطیدن" سے کم کسی بات پر معاملہ ہی نہیں ہوتا! ؎

"بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!"